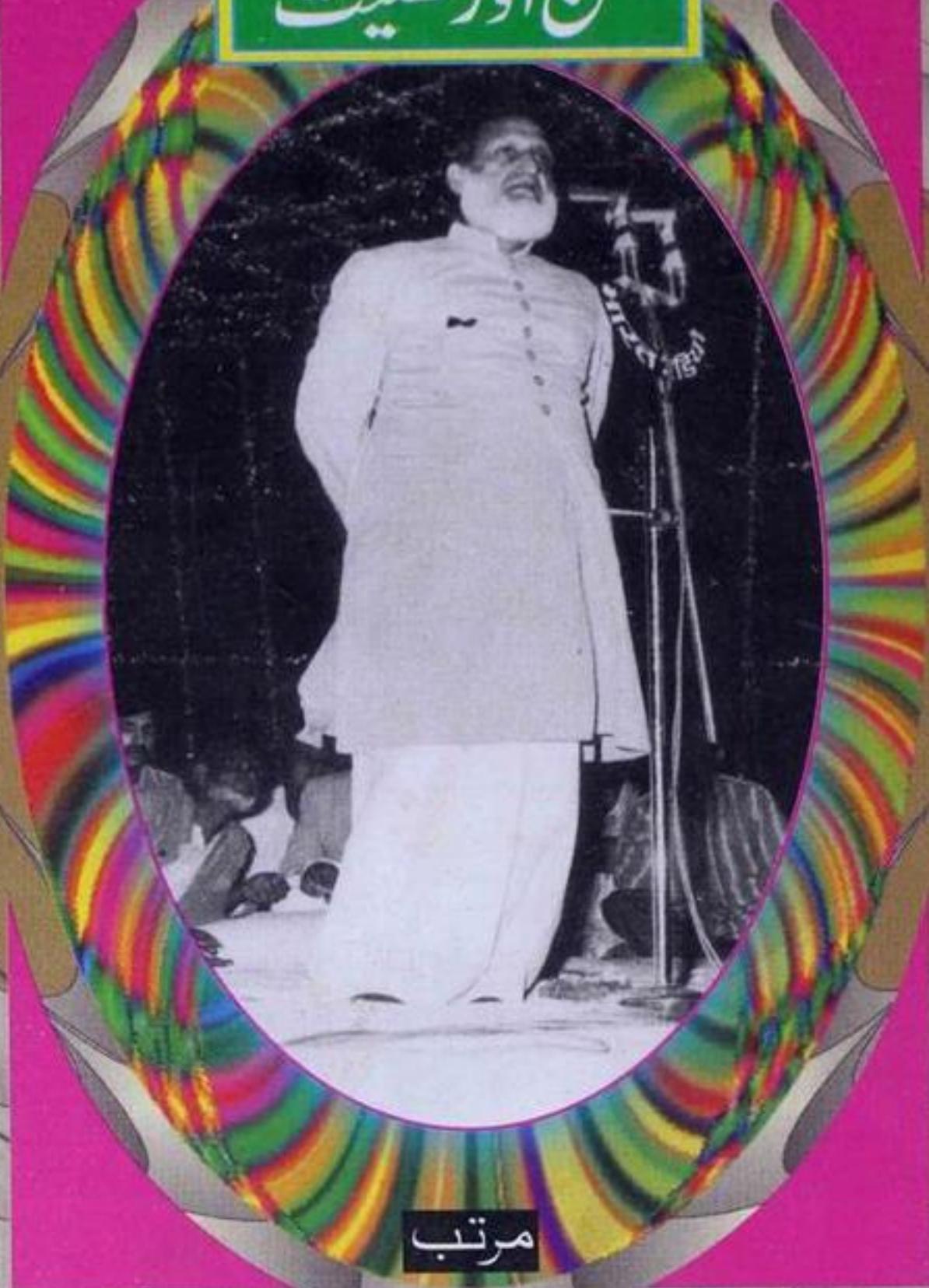


# فنا نظمی

”فن اور شخصیت“



مرتب

عشرت نظر

ناشر

جگرا کیدمی گانپور



# فنا نظائی

”فن اور شخصیت“

مرتب

عشرت ٹف

ناشر

جگرا کیدھمی کانپور

نام کتاب	: فنا نظا می .. "فن اور شخصیت"
شاعر	: شا رعلی بیگ فنا نظا می (مرحوم)
والد کا نام	: مرزا مسعود علی بیگ مرحوم
سنہ پیدائش	: ۱۹۲۲ء
تاریخ وفات	: ۱۸ جولائی ۱۹۸۸ء
مرتب	: عشرت ظفر
سال اشاعت	: ۲۰۰۳ء
قیمت	: ۱۰۰ روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ	: یا وردارثی (این - آر۔ کمپیوٹر گرافس، کانپور)
فون نمبر:	0512-2547253
سرور ق	: یا وردارثی
طبعات	: چمن انٹر پرائزز، دہلی
سائز	: ۱۸x۲۲/۸ (اچ)
ناشر	: جگرا کیڈمی، 88/89، چمن گنج کانپور
فون نمبر:	0512-2551236

---

ملنے کا پتہ

## جگرا کیڈمی

88/89، چمن گنج کانپور

انتساب



شعروخن کے نکتہ داں

## جناب شکیل مرزا

کے نام

جنہیں علی ادبی ذوق اپنے والد محترم

جناب مرزا محمد سے دریے میں

وڈیعت ہوا۔



آل مہرباں کہ آبروئے ہفت کشور است

# حرف در خشائش

فنا نظامی فن و شخصیت ایک ایسی کتاب ہے جسے جگرا کیدی کے برسوں کے خوابوں کی تعبیر کہا جاسکتا ہے، مرحوم فنا نظامی کا جگرا کادمی سے ایک خاص رشتہ ہے۔ وہ برسوں یہاں تشریف فرماتے رہے، علامہ شارق ایرایانی کا وہ بے حد احترام کرتے تھے اور اس تنظیم کے تمام اراکین سے بے حد محبت و شفقت فرماتے تھے۔ فنا نظامی عالمی شهرت کے مالک تھے مگر ان میں ذرا بھی غرور کاشا بہ نہ تھا۔ انتہائی عجز و انکساری کا پیکر تھے۔ وضع داری ان کے مزاج کا ایک خاص حصہ تھی۔ ان کی وفات کو کم و بیش پندرہ برس ہونے کو آئے، ان پر کتاب شائع ہونا ہر چند کہ ایسا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر کچھ آسان بھی نہ تھا کیونکہ مرحوم کا کلام جمع کرنے میں بے حد دشواری پیش آئی وہ اپنا کلام شائع نہیں کراتے تھے ان کے لو احقین نے کلام کی فراہمی میں جگرا کادمی کے ساتھ تعاون نہیں کیا لیکن بہر حال یہ تہبیہ کیا جا چکا تھا کہ جگرا کادمی فنا نظامی پر جس قدر بھی ممکن ہو گا مبسوط کتاب شائع کرے گی۔ برسوں یہ سب کام ہوتا رہا، کلام جمع کیا جاتا رہا، ان کے قریبی حلقوں میں رہنے والوں، دوستوں اور مخلصین سے مددی جاتی رہی۔ اس میں جناب شیخ عثمانی، جناب اعجاز انصاری اور جناب عارف محمود کا تعاون سب سے اہم ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی ڈائری سے فنا صاحب کی متعدد غزلیں عنایت فرمائیں۔ ہم اس کیلئے ان کے ممنون و مشکر ہیں۔ مرحوم کے فن و شخصیت پر مضافاً میں لکھوانے کی

کوشش جاری رہی۔ آخر کار برسوں بعد یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب مرحوم کے فن و شخصیت کا تفصیلی احاطہ کرتی ہے لیکن اس شاہراہ کا ایک روشن سنگ میں ضرور ہے کیونکہ بعد میں آنے والوں کیلئے یہ کتاب ایک تحریک ثابت ہوگی جس کی روشنی میں وہ اپنا سفر جاری رکھ سکیں گے۔

جگرا کادمی نے اس سے پہلے بھی کئی کتابیں شعری مجموعے شائع کرائے ہیں اور گذشتہ پچاس برس سے یہ ادارہ علم و فن کی خدمت کر رہا ہے۔ جگرا کادمی کو الحاج ارشاد مرزا رئیسِ اعظم کانپور، جناب شکلیل مرزا، جناب ایس۔ ایم۔ شاہد کی رہنمائی و رہبری حاصل ہے۔ یہ حضرات ہر طرح سے اس ادارے کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ بے حد مسرت انگیز بات یہ ہے کہ اس ادارے میں مخلصین کی ایک جماعت ہے جو ہر زاویے سے ادارے کیلئے کام کرتی ہے۔ خواہ وہ کتابوں کی اشاعت ہو، کل ہند مشاعرے ہوں یا پھر سالانہ طرحی نشیتیں، سارے مجازوں پر ادارہ فعال ہے اور تمام کارکردگی گلستانوں اور سو و نینروں کی شکل میں محفوظ ہے۔ آخر میں اپنے تمام مخلصین و محبین کا ہم شکر یہ ادا کرتے ہیں۔

## شاعر فتح پوری

جزل سکریٹری، جگرا کادمی کانپور

۱۳ اپریل ۲۰۰۳ء

# فنا نظاہمی

## شخصیت اور شاعری

نامی النصاری

مشاعروں کے مقبول ترین شاعر، فنا نظاہمی (۱۹۲۲ء تا ۱۹۸۸ء) اپنی ذات و صفات میں بھی ایک منفرد اور وضعدار انسان تھے۔ سرخ و پیدرنگ، مغل انداز کا کتابی چہرہ، لمبا قد، سفید داڑھی، چوڑی مہری کا سفید پاجامہ، شیر و ابی، ٹوپی اور ہاتھ میں ایک عمدہ چھڑی کے ساتھ وہ جس محفل میں جاتے، وہاں سب سے الگ اور نمایاں نظر آتے۔ پان کھانے کے بہت شائق تھے، اس لئے پان کی ڈبیا ہر وقت ساتھ رہتی تھی۔ اپنے شاعرانہ وقار کے بارے میں حساس تھے لیکن چھوٹے بڑے، ہر ایک سے ملتے تھے اور کسی بھی محفل میں بیٹھنے اور کسی سے ملنے میں پر ہیز نہ تھا، چاہے وہ معمولی اور غریب آدمی ہو یا رئیس اور دولت مند۔ شاعر برادری کی عام روشن کے برخلاف، فنا صاحب وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ سنا ہے کہ کسی مقامی مشاعرے میں شرکت کیلئے اگر انہوں نے کسی سے وعدہ کیا تو یہ بھی تاکید کردی کہ ٹھیک وقت پر مثلاً دس نج کر تیس منٹ پر آپ آ کر مجھے لے جائیں۔ اگر وہ شخص مقررہ وقت سے پانچ منٹ بعد بھی پہنچا تو پھر فنا صاحب اُس سے مس ہونے والے نہیں تھے۔ دوسری طرف، اپنی جانب سے وہ ٹھیک دس بجکر تیس منٹ پر بالکل تیار ملتے تھے اور اس میں وہ اپنی طرف سے ایک منٹ کی تاخیر بھی نہیں کرتے تھے۔ وقت کے معاملے میں وہ انگریزوں کی پیروی کرتے تھے لیکن اپنے اطوار و عادات میں سرتاسر مشرقی تھے۔ مزاج میں تکلف

اور تصنیع بالکل نہ تھا۔ ہر ایک سے کھلے ڈالے انداز میں ملتے تھے۔ اکثر اچانک ہی کسی محفل میں یا کسی ملاقاتی کے یہاں پہنچ جاتے تھے اور بالکل بے تکلفی سے گھل مل جاتے تھے۔

راقم الحروف کی ان سے جان پہچان پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں کرنل گنج (کانپور) کے ایک چائے خانے میں ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا بدن چھر ریا اور داڑھی سیاہ تھی لیکن بس حسب دستور پیجا مہ، کرتے، شیر و انی اور ٹوپی پر مشتمل تھا۔ ہاتھ میں چھڑی اس وقت بھی رہتی تھی حالانکہ بے ضرورت تھی۔ یہ ان کی اٹھان کا زمانہ تھا اور ان کی شهرت ابھی دور دوستک نہیں پہلی تھی۔ اسکے بعد ان سے کبھی کبھی ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن جب بھی ملتے بڑی اپنا سیت سے ملتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ دو پھر کو میرے غریب خانے پر آگئے۔ میں اس وقت پر یہ پرستیم خانے کے سامنے ایک کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ میں ان کو اوپر کمرے میں لے گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا، اس پر دراز ہو گئے۔ کہنے لگے کچھ وقت یہیں گزاروں گا۔ میں نے کہا، چشم ماروشن، دل ماشاد۔ کھانے کیلئے کہا تو انکار کر دیا، البتہ چائے پی لی اور گپ شپ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر جس طرح آئے تھے، اسی طرح اچانک جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ میں نے روکنے کی کوشش کی تو ”بس۔ پھر کبھی“ کہہ کر زینے سے اترنے لگے۔ میں نے عزت و احترام کے ساتھ ان کو رخصت کیا۔ اس زمانے میں راقم الحروف اور سعید اختر نعمانی (مرحوم) زیادہ تر ساتھ رہتے تھے اور شعروخن سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ فنا صاحب، ہم دونوں کی اس بات کے لئے تعریف کرتے تھے کہ ہم دونوں خود شعر کہتے ہیں اور کسی استاد سے کہلو اکراپنے نام سے نہیں پڑتے، جبکہ اس وقت کی (اور آج کی بھی) عام روشنی یہی تھی۔

جہاں تک فنا نظامی کی شاعری کا تعلق ہے تو یقیناً وہ ایک خوش فکر شاعر تھے۔ عروض کی بھی خاصی جانکاری تھی اور زبان کے معاملے میں بھی کسی سے ہی نہیں تھے،

ان کے کچھ مشہور ترین اشعار درج ذیل ہیں جن میں طرزِ ادا کی ندرت اور ایک قسم کا والہانہ پن بہت نمایاں ہے:

میں چلا شراب خانے، جہاں کوئی غم نہیں ہے  
جسے دیکھنا ہو جلت، مرے ساتھ ساتھ آئے  
اس فتنہ گر کی نیند اللہ، اللہ  
سوئی قیامت، محشر جگا کر  
ترکِ تعلقات کو اک لمحہ چاہئے  
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا  
اک تیرے دیکھنے کیلئے بزم میں مجھے  
اوروں کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا  
یہ عمارت تو عبادت گاہ ہے  
اس جگہ اک میکدہ تھا کیا ہوا

موخر الذکر شعر تو ایسا ہے کہ فنا صاحب ہندو پاک کے بڑے بڑے مشاعروں میں اس کو اپنے خاص انداز میں، عبادت گاہ کہہ کر اپنی سفید داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جھوم جھوم کر پڑھتے تھے تو بلا مبالغہ مشاعرہ گاہ کی چھتیں اڑ جاتی تھیں اور سامعین بخود ہو جاتے تھے۔

فنا نظامی کا مجموعی رنگِ شاعری، جگہ اسکوں کی شاعری سے تعلق رکھتا تھا۔  
غزل کے روایتی معاملاتِ حسن و عشق اور کبھی کبھی اچھتے ہوئے انداز میں اطوارِ زمانہ پر تبصرہ، ان کے پسندیدہ موضوعات تھے، لیکن اس تنکنائے غزل میں بھی وہ طرزِ ادا کی ندرت سے ایک خوشگوار کیفیت پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ میرا پختہ خیال ہے کہ شاعری، بالخصوص غزل میں طرزِ ادا کی ندرت شعر کو چکانے اور نقشِ معنی اجائے میں خاص کردار ادا کرتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ محض طرزِ ادا نے ایک معمولی مضمون

کے شعر کو جیس سے کہیں پہنچا دیا ہے اور یہ بھی ہوا ہے کہ بلند پایہ مضمون یا خیال بھی  
ست بندش کے باعث معمولی درجہ کا شعر بن کر رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر میر کا یہ  
مشہور شعر دیکھئے۔

ناز کی اُس کے لب کی کیا کہئے  
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

محب کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑی سے تبیہ دینا ایک معمولی اور بالکل  
سامنے کی بات ہے جسے اکثر شاعروں نے باندھا ہے مگر میر نے اس معمولی تبیہ میں  
”کی سی“ کا پونڈ لگا کر شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ اس میں کلیدی لفظ صرف  
”کی سی“ ہے جس کی وجہ سے یہ شعر اتنا بلند اور اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ میر کے بہترین  
اشعار میں اس کا حوالہ سب سے پہلے آتا ہے۔

طرزادا کی ندرت اور مضمون کی شوخی و جدت کے اثرات سے فنا نظامی خوب  
واقف تھے اور شعوری طور سے شعر میں مضمون اور طرزِ ادا دونوں میں نیا انداز پیدا کرنے  
کی کوشش کرتے تھے۔

اتنی آرائش آشیانہ  
ٹوٹ جائے نہ شاخ نشیمن  
اُن گلوں سے تو کانٹے ہی اچھے  
جن سے ہوتی ہے تو بین گلشن  
آج یوں ہی ساقیا جامِ ارغوان چلے  
جیسے بزمِ وعظ میں شیخ کی زبان چلے  
ہائے کیا چیز ہے یہ لطفِ شکستہ پائی  
حوالے اور بڑھے کوششِ ناکام کے بعد

جگر صاحب ان کے ترجم کی وجہ سے ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ جب بھی کانپور آتے تو فنا صاحب ان کی مجلس میں ضرور موجود ہوتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان آزاد ہو چکا تھا اور جگر مراد آبادی شراب سے تائب ہو چکے تھے۔ وہ عموماً گناہ دھرناتھ فرحت کے یہاں، جو خود بھی ایک زود گوشاعر تھے، ہٹھرتے تھے، اور وہیں ان کے خاص خاص احباب کی محفل جنمتی تھی۔ مجھے کئی مرتبہ فرحت صاحب کے یہاں کی مجلسوں میں نیازمندانہ شرکت کا موقع ملا ہے۔ شاعرانہ پندرہ تو تقریباً ہر شاعر میں ہوتا ہے لیکن وضعداری اور رکھ رکھاؤ میں جگر، نشور اور فنا کا جواب نہ تھا۔ فنا نظامی نے ستم یہ کیا کہ اپنا مجموعہ کلام بھی شائع نہیں کروایا۔ انہوں نے کچھ اور چالیس برسوں تک داخن دی اور اتنی غزلیں تو ضرور ہی کہی ہوں گی جن سے ایک او سط ضخامت کا مجموعہ مرتب کیا جاسکتا تھا مگر مجموعہ نہ چھپوانے کی ان کے پاس مضبوط دلیل بھی تھی۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا کہ مجموعہ کلام شائع ہونے کے بعد وہ سب کی نظر وہ میں آجائے گا پھر جب میں مشاعروں میں جا کر شعر نانے لگوں گا تو سامعین نئی غزل کی فرمائش کریں گے۔ میں ہر مشاعرے کیلئے نئی غزل کہاں سے لاوں گا۔ ان کی یہ دلیل اتنی فطری اور باوزن تھی کہ میں خاموش ہو گیا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ انتقال کے دس بارہ برسوں ہی میں فنا بھلا دیئے گئے۔ اب فنا نظامی سے وہی لوگ واقف ہیں جن کی عمر میں پچاس سال یا اس سے اوپر ہیں۔ نئی نسل نے فنا کو مشاعروں میں جادوجگاتے نہیں دیکھا اسی لئے وہ اس نسل کے ذہن کا ایک حصہ نہیں بن سکے اور ماضی کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے۔

فنا نظامی کو پان کھانے کا بہت شوق تھا۔ تمبا کو بھی کھاتے تھے جس نے آہستہ آہستہ ان کے گالوں کو کھالیا۔ دو تین سال سخت بیمار رہ کر آخر کار ۱۸ جولائی ۱۹۸۸ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

کانپور میں ان کے ہم عصروں میں نشور واحدی، شارق ایریانی، ندرت

کانپوری، کوثر جائسی، وفاشا بجہا پوری، گنگا دھرفرت، حشی کانپوری وغیرہ تھے۔ فنا ان سب سے بہ لحاظِ عمر، قدرے جو نیر تھے تاہم ان کی دلکش اور جامدہ زیب شخصیت اور عوامی مقبولیت میں نشور واحدی کے علاوہ، کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ اپنی ذاتی زندگی میں جو آن بان فنا نظامی کی تھی وہ کسی اور کے حتھے میں نہ آئی۔ ان کی وفات کو پورے چودہ سال گزر چکے ہیں لیکن میرے تصور میں اب تک ان کی شخصیت کے دلاؤز نقوش روشن ہیں اور شاید بہت دنوں تک روشن رہیں گے۔

۲۰۰۳ء / ۲۲ اگست



# فنااظامی کی شخصیت.....

عارف محمود

B-307, Sector 26

نومبر 2013ء (جی بی نگر)

نوٹ: زریز مضمون میں فنااظامی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ہی آج سے ترین سال قبل کے کانپور کی ادبی سرگرمیوں کی بھی مختصر جھلک ملے گی جیسا کہ میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ شاعر کے فن اور شاعری پروہی حضرات روشنی ڈالیں گے جن کا یہ منصب ہے۔

فناصاحب کو میں نے پہلی بار ۱۹۵۰ء میں اپنے وطن ردوی کے ایک مشاعرے میں دیکھا اور ساتھا۔ اس سے پہلے صرف ان کے کچھ اشعار سن رکھے تھے جو ان لوگوں نے مشاعروں میں سے ہوں گے۔

اس مشاعرے میں مہماں ان کی خاطر تو واضح کا فرض ہم چار پانچ لڑکوں پر تھا جو اس وقت سب ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ قصبه کی ادبی روایات کے مطابق شعر سمجھنے کی صلاحیت ہم سب لڑکوں میں اپنی عمر اور تعلیم کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ تھی۔ یہ فیض تھا قصبه کے اس ادبی ماحول کا جہاں شعری نشستیں اور مشاعرے اکثر ویژتھر ہوا کرتے تھے۔ اس قصبه نے اردو ادب کو چودھری محمد علی جیسا ادیب اور اسرار الحق مجاز جیسا شاعر دیا۔ عتیق صدیقی، ڈاکٹر آفتاب احمد جیسے اردو ادب کے استاد عطا کئے اور یہ

سلسلہ ڈاکٹر شاربِ ردولوی، ڈاکٹر خورشید نعمانی، پروانہ ردولوی سے ہوتا ہوا نوجوان ادیب ڈاکٹر انور حسین خاں اور رفتعت عزیزی تک پہنچتا ہے۔

بہر کیف، ہم لوگ منتظر تھے کہ کب حضرت فنا نظامی کو زحمتِ سخن دی جائے اور ان کو سننے کا انتظارِ ختم ہو۔ مشاعرے میں مقامی شعرا کے علاوہ کچھ شاعر لکھنؤ کے تھے اور کانپور سے صرف فنا صاحب تھے۔ شاید آخر ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ فنا صاحب کا لی شیر و انبی میں اپنے گورے چٹے رنگ کی وجہ سے بہت نمایاں تھے۔ مشاعرہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ صحیح تقریباً چار بجے فنا صاحب کو زحمت دی گئی۔ سامعین جیسے ایک دم جاگ پڑے۔ کسی نے آوازِ دی محترم وہی چھوٹی بھروسی غزل پڑھنے گا جو آپ نے فلاں مشاعرے میں پڑھی تھی۔

فنا صاحب ڈاکٹر سامنے آئے۔ پہلے بلکہ سر میں کچھ گنگنا یا پھرو ہی غزل شروع کی جس کی فرمائش تھی۔ جس کا مطلع تھا:

عشق ہے بندہ حسن ہے رب

جرائم وفا ہے جتبشِ لب

مطلع نے ہی سامعین کو ہلاکر رکھ دیا۔ کئی بار پڑھوایا گیا۔ صحیح کی تھنڈی ہوا اور فنا صاحب کا جادوی ترنم۔ غزلِ ختم ہوئی تو ایک اور ایک اور کاشور ہوا۔ دوسری غزل شروع کی:

جب بھی بیٹھا ہوں دامنِ کوئینے

مجھ کو چھیڑا ہے دیوانگی نے

مطلع ختم ہی ہوا تھا کہ قریب کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آئی ”اللہ اکبر“ فنا صاحب ٹھہر گئے۔ کسی منچلے نے آواز لگائی ”آج فجر کی نماز قضا پڑھ لیں گے“ اذان ختم ہوئی تو صدرِ مشاعرہ نے اعلان کیا کہ جو لوگ نمازِ ادا کرنے جانا چاہتے ہیں وہ

میرے ساتھ چلیں، نماز کے بعد مشاعرہ جاری رہے گا۔ ہم لوگوں نے موقع غنیمت  
جانا اور موجود شعراء اور سامعین کو چائے پیش کر دی۔

نماز کے بعد مشاعرہ پھر شروع ہوا۔ ایک غزل، دوسری غزل، تیسرا حتیٰ کہ  
دھوپ نکل آئی، فنا صاحب تھک چکے تھے لیکن سامعین اٹھنے کا نام، ہی نہیں لے رہے  
تھے۔ آخر کار چوتھی غزل کے بعد صدر نے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا۔  
یہ تھا میرا پہلا تاثر حضرت فنا نظامی کے بارے میں۔

اور پھر پانچ سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ ۱۹۵۵ء میں جب میں بہ سلسلہ  
ملازمت و تعلیم کا نپور آیا تو میرا قیام محلہ پٹکاپور میں ہوا جو اس زمانہ میں ادبی سرگرمیوں  
کے لئے کافی معروف تھا۔ آپ کو تعجب ہو گا کہ ہندوستان میں شاید یہ پہلی مثال ہے کہ  
وہاں کے ایک شاعر انور پٹکاپوری اپنے محلہ کے توسط سے مشہور تھے۔ وہاں تو نواب  
قیصر حسین صاحب قیصر کے دولت خانہ پرانجمن ادب عالیہ کے زیر اہتمام اکثر نشستیں  
ہوتی تھیں۔ جس میں کانپور کے اساتذہ بھی تشریف لاتے تھے۔ وہیں میری ملاقات  
ایک بار پھر فنا نظامی صاحب سے ہو گئی اور ہم لوگ بہت جلد ایک دوسرے کے مزاج  
دال بن گئے۔ عمر کے فرق کے باوجود وہ میرے دوست بھی تھے اور محترم بزرگ بھی  
اور یہ رشتہ ان کے آخری وقت تک قائم رہا۔ میرے سارے بچے ان کو دادا کہتے تھے  
میری چھوٹی بیٹی کا نام ”عطیہ“، ان کا ہی رکھا ہوا ہے۔ اتنی لمبی تمهید بیان کرنے کا مقصد  
صرف یہ ہے کہ اب میں ان کے بارے میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں وہ میرے اپنے  
مشابدات پر منی ہو گایا پھر ان کے اس انشرویو سے ماخوذ ہے جو میں نے ان کے انتقال  
سے کچھ عرصہ قبل ریکارڈ کیا تھا۔

ہاں تو ذکر تھا ۱۹۵۵ء کا اس وقت کا نپور میں کئی ادبی انجمنیں تھیں۔ اس کے  
علاوہ استاد شعراء کے گروپ تھے۔ فعال انجمنوں میں ”ادب عالیہ“ اور ”فنکارانِ جدید“

کافی مشہور تھیں۔ ادب عالیہ میں زیادہ تر عمر شعر اور استاد قسم کے شاعر شامل تھے لیکن فنکارانِ جدید میں نئے اور نوجوان شاعر تھے۔ بڑے مشاعروں کے برپا کرنے میں کیف اکرمی اور منظر ایٹھوی پیش پیش رہتے تھے۔ آپس میں ادبی روایات کے مطابق خوب چیقلش بھی رہتی تھی لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ فنا نظامی صاحب نہ تو کسی انجمن کے باقاعدہ ممبر تھے اور نہ کسی خاص گروپ میں شامل تھے۔ وہ ہر اس جگہ شریک ہوتے جہاں ان کو احترام کے ساتھ مددو کیا جائے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ کچھ شعر ایک سرد جنگ کا جیسا ماحول رکھتے تھے لیکن براہ راست بات کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ کانپور کے مشاعروں اور نشستوں میں جہاں فنا صاحب شریک ہوئے میں نے ہمیشہ ان کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ کانپور سے باہر غیر ملکی سطح پر بھی صرف دونام سامنے تھے۔ حضرت نشور واحدی اور فنا نظامی۔

جس طرح ہر شہر میں ادباء اور شعرا کے مستقل بیٹھنے کی کوئی خاص جگہ ہوتی ہے۔ اسی طرح کانپور میں نئی سڑک کا گرانڈ ہوٹل تھا جہاں روز شام کو ادبی مخلفیں جمیں اور مبارحہ ہوتے رہتے۔ اس میں دو گروپ ہوتے تھے۔ ایک استاد قسم کے پرانے شاعروں کا وہ بڑا گروپ تھا۔ دوسرا درحقیقت گروپ نہیں تھا بلکہ ان سے الگ ہٹ کر چونکہ فنا صاحب بیٹھتے تھے اس لئے کچھ لوگ ان کے ساتھ بیٹھتے۔

ایک بار میں بھی فنا صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ندرت کانپوری صاحب دوسرے گروپ سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے ہم لوگوں کی طرف آئے۔ بھی میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں نا؟ اور ایک نیچ پر بیٹھ گئے، ”جی فرمائیے، فنا صاحب ہر حملہ کیلئے تیار تھے۔“ ”بھی مولا نایاروں کا خیال ہے کہ کل شام کو نشت میں آپ نے جو غزل پڑھی تھی اس کے فلاں شعر کا یہ مصرعہ کچھ تشریح چاہتا ہے۔ ندرت صاحب نے مصرعہ پڑھ دیا۔

فنا صاحب مسکرائے، پھر ان کیلئے چائے کا آرڈر دیا۔ دو چار منٹ خاموش رہ کر میر تقی میر کا ایک شعر پڑھا۔ کچھ رک کر ایک مصرعہ اور پڑھا۔ یہ مولانا حسرت کا ہے۔

جا کر اپنے یاروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ غلط ہے تو میرا مصرعہ بھی غلط ہے۔ ندرت صاحب کی بڑی بڑی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ پھر منہ بھی کھل گیا۔ جلدی جلدی چائے ختم کی اور اپنی پالی میں چلے گئے۔ اصل میں ندرت صاحب ادھر بھی تھے اور ادھر بھی۔ ان کو اس میں لطف ملتا تھا۔ اُنکے جاتے ہی فنا صاحب بھی اٹھ گئے، ”آؤ چلو۔ اب ندرت صاحب کافی ہیں ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے۔“

اس واقعہ کے کچھ روز بعد کسی بات پر ندرت صاحب اور ان کے پرانے رفقا میں آن بن ہو گئی اور وہ فنا صاحب کے ساتھ بیٹھنے لگے۔ اتفاق سے چند دنوں بعد ایک مشاعرہ ہوا جس میں ندرت صاحب نے اپنے پرانے ساتھیوں کو جلانے کیلئے یہ مقطع پڑھا۔

### فنا سے ربط پیدا کر کے ندرت

حیاتِ جاوداں تک آگئے ہیں

شہر میں اس شعر کا خوب شور ہوا۔ فنا صاحب پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا بلکہ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ یہ نئی دوستی نقصان بھی پہوچا سکتی ہے۔ ابھی کچھ ہی عرصہ گزر رہا ہے میں نے ایک دن دیکھا ندرت صاحب اپنی پالی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اس دن گرانڈ دیر میں پہوچا تھا۔ میں نے عرض کیا، ”حضرت یہ ادھر کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟“

”یہ آپ ان ہی سے جا کر پوچھئے۔“ فنا صاحب کچھ اکھڑے سے دکھائی دیئے۔ میں نے بات دوسری طرف موڑ دی۔ ”محترم میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ اور آپ؟“

”ہاں بھوک تو مجھے بھی لگی ہے شاید غصہ کی وجہ بھی یہی ہے۔ چلو کہیں بربیانی کھائی جائے۔“ ہم لوگ گرانڈ سے اٹھ گئے۔ اصل میں ان کو بربیانی اور نہاری پائے کھانے کا بہت شوق تھا۔ مرج بالکل نہیں کھاتے تھے لیکن بازار کی بربیانی یا پائے کیلئے آنکھیں بند کر کے آتشِ نمرود میں کو دجاتے تھے اور پھر اس وقت ان کی حالت قابل دید ہوتی۔ پسینہ بہہ رہا ہے، آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں۔ سُو سُو کرتے جا رہے ہیں لیکن مجال ہے کہ بغیر ختم کئے اٹھ جائیں۔

جس طرح شہر میں ندرت صاحب کی دوستی اور ان کے شعر کا چرچا ہوا، اسی طرح یہ بات بھی مشہور ہو گئی کہ پھر اس نئی جوزی میں ان بن ہو گئی۔ اس عرصہ میں کہیں ایک نشست اور ہو گئی جس میں جناب افرا ناروی نے جو کہ اچھے اور زود گوش اشعار تھے لیکن اپنی سادگی اور اپنے حلیہ کی وجہ سے شعراء میں صحیح مقام نہ پاسکے تھے ندرت صاحب کو مناطب کر کے یہ شعر پڑھ دیا:

حیات جاوداں کا مدعاً اب  
فنا کے گھاث اُترا جا رہا ہے

واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور کے ساتھ ہی اس شعر نے جو شہرت حاصل کی اس کی گونج آج بھی کانپور میں موجود ہے۔ یہ تھا اس وقت کانپور کا ادبی ماحول اور شعراء کی سرد جنگ کا نقطہ عروج جس میں فنا نظامی جی رہے تھے۔

اس سے قبل کہ میں فنا صاحب کے سلسلے میں اپنی پرانی یادوں کو اور قریب لاوں بہتر ہو گا کہ اُنکے اس انٹرویو کے کچھ حصے پیش کر دوں جو میں نے ان کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل ان ہی کے گھر پر ریکارڈ کیا تھا۔ اس انٹرویو کو حاصل کرنے کیلئے مجھ کو کتنے پا پڑنیے پڑے تھے یہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ان کی نازک مزاجی اور سخت مزاجی دونوں سے واقف ہوں۔ بہر کیف آپ بھی سن لیں:-

(عارف محمود) شاعری کب اور کیسے شروع کی؟ میرا مطلب ان حالات سے ہے ہے  
جنہوں نے آپ کو شاعر بنایا۔ ع۔م

(فنا نظامی) شاعری تو میں آج بھی نہیں کرتا۔ ہاں شعر کہنے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب میں افتخار آباد کی مسجد کے مدرسے میں پڑھتا تھا، پہلے یہ عرض کر دوں کہ گھر کا ماحول بھی کچھ مولویانہ تھا میرے والد مجدد بصفت آدمی تھے بہر حال مدرسہ میں مولویوں کا ساتھ تھا، تقریباً سب اساتذہ خود شاعر تھے، حافظ عبد الشکور صاحب مسجد کے امام بھی تھے اور مدرس بھی، اچھے شاعر بھی، وہ میرے مریب بھی تھے، حافظ سلامت اللہ صاحب شیر، حافظ مراد علی مراد اور کبھی کبھی خواجہ عزیز احسن مجذوب بھی تشریف لاتے۔ بڑی بزرگ شخصیت تھی ان کی، بڑے نیک اور نستعلیق شاعر۔ بس صاحب اسی صحبت نے مجھے شاعری کا روگ لگا دیا۔ یہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ اب جو شعر کہنے شروع کئے تو ایک دن میں دو دو غزلیں کہہ ڈالیں۔ اس پر حافظ عبد الشکور صاحب بہت ناراض ہوئے، ”پہلے پڑھنے میں دل لگا و پھر کہنا“، اب صاحب یہ ہوا کہ شعر تو کہتا رہا لیکن ڈر کی وجہ سے ان کو دکھائے نہیں۔ کچھ عربی فارسی مدرسہ میں پڑھی پھر مزید فارسی اپنے حقیقی پھوپھا مولانا خاں زماں خاں صاحب جو کہ مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور میں مدرس تھے ان سے پڑھی۔ جناب عارف صاحب آپ کو تعجب ہو گا کہ یہ داڑھی جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ پیدائشی سمجھتے کیونکہ اس پر آج تک اُستر انہیں لگا۔ میرا لباس بھی شرعی تھا۔ اونچا پا انجامہ، لمبا کرتہ، سر پر دو پلی ٹوپی اور گلے میں مولویوں والا رومال، سرمنڈا ہوا..... لیکن اپنے خداداد ترجم کی وجہ سے مقامی مشاعروں میں بلا یا جانے لگا۔

ع۔م

ف۔ن

باہر کے مشاعرے کب سے پڑھنا شروع کئے؟

غالباً ۱۹۳۰ء میں پہلا باہر کا مشاعرہ رنجیت پور وہ ضلع اناوہ میں پڑھا اور خدا کا شکر ہے کہ بہت کامیاب رہا۔ اسکے بعد میں نے اُس ضلع کے قصبہ موراوال میں پڑھا۔ ان دو مشاعروں سے میری شہرت کا نپور سے باہر پہنچی۔ پھر کا نپور کے بڑے مشاعروں میں بھی بلا یا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ کے ایک آل انڈیا مشاعرے کا دعوت نامہ آگیا بہت ڈرتے ڈرتے لکھنؤ گیا۔ پہلی بار لکھنؤ جیسے شہر میں پڑھنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ مشاعرہ گاہ میں حد نظر تک آدمی ہی آدمی۔ یونیورسٹی کا مشاعرہ اور اسرار الحق مجاز کا زمانہ۔ ہر طرف سے شور مجاز کو بلا یئے، مجاز کو بلا یئے۔ شعراء آتے رہے اور جاتے رہے۔ پہلک کسی کو سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ آخر عاجز آ کر ناظم مشاعرہ نے اعلان کیا کہ صرف دو مشاعروں کو اور سن لیجئے جو کا نپور سے تشریف لائے ہیں بس پھر مجاز کو سننے گا۔ مجمع سے آواز آئی، چلے ان کو بھی بھیج دیجئے۔ گویا انتقام اجازت ملی تھی کہ دیکھوان کی درگت بھی دیکھ لو۔ میں اور ڈر گیا۔ کا نپور کے ایک بزرگ شاعران کا نام نہیں لوں گا، بلا یئے گئے ڈھائی شعر پڑھ کر واپس آگئے کہ میرا نام پکارا گیا اور جب میں سامنے آیا تو میرا حلیہ دیکھ کر ہی سارا مجمع ہنس دیا۔ منڈے ہوئے سر پر دوپلی ٹوپی، لمبا کرتے، اوپھا پائیجا مہ اور گلے میں رومال۔ میں نے بغیر اس کی پروا کئے فوراً نہایت ملکے ترجم میں ایک قطعہ پڑھ دیا جو صرف ڈا اس پر سنا گیا یا پھر سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں نے سنا ہو گا لیکن ترجم کی گونج شاید ہوٹ کرنے والوں تک بھی پہنچی۔ آواز آئی، کیا پڑھا؟ پھر سے پڑھئے، میں نے برجستہ کہا، کچھ پڑھا نہیں تھا صرف گنگنا یا تھا ایک زور دار قہقہہ پڑا اور مجمع کا مود دیکھ کر میں نے فوراً غزل شروع کر دی۔ جس کا مطلع تھا:

ہر شے رہ طلب میں مانا کہ معتبر ہے  
 دشواریوں سے پہلے آسانیوں کا ڈر ہے  
 سامعین خاموش ہونے کیلئے تیار تھے۔ اسلئے میں نے غزل آگے  
 بڑھائی اور جب میں غزل کے اس شعر پر پہنچا:  
 پھر دیکھ میری جانب اک بار جاتے جاتے  
 کچھ اور مسکرا لوں رونا تو عمر بھر ہے  
 تو سامعین کا مزاج بدل چکا تھا یا تو سننے کو تیار نہیں تھے یا اب ایک اور  
 ایک اور کا شور تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس رات مجاز کے بعد میں سب  
 سے کامیاب شاعر ہا اور اس کے بعد بطور آل انڈیا شاعر پورے  
 ملک میں مشہور ہو گیا۔ باہر کے مشاعروں کے دعوت نامے موصول  
 ہونے لگے۔

کھٹ سے اک آواز آئی اور ٹیپ ریکارڈ بند ہو گیا۔ میں نے معدترت  
 چاہی، محترم دومنٹ رک جائیں میں کیست تبدیل کر دوں اندر سے  
 چجی صاحبہ کی آواز آئی، ”آپ نے نمک پارے نہیں منگوائے اب  
 خالی چائے بھیج رہی ہوں۔ عارف کی بیگم کو بھی صرف چائے پلا دی  
 ہے۔

فنا صاحب نے برجستہ جواب دیا، ”ان کے شوہر نامدار کی نمک پاشی  
 کچھ کم ہو تو نمک پارے منگواؤں۔“ اور پھر زور دار قہقہہ۔

میں نے کیست تبدیل کر دیا تھا، ”حضرت نمک پاشی شروع کروں؟“  
 لوگ کہتے ہیں کہ آپ جگر صاحب کے شاگرد ہیں لیکن اتنی دیر کی  
 بات چیت میں آپ نے اب تک کہیں بھی ان کا نام نہیں لیا؟

ف-ن

آپ نے اچھا کیا یہ سوال کر لیا۔ کہنے والے لوگ عقل کا استعمالِ مَم کرتے ہیں۔ میں ابھی بتلا چکا ہوں کہ میں نے ۱۹۳۲ء سے شاعری شروع کی ۱۹۳۰ء سے باہر کے مشاعرے پڑھنے لگا ایکن اس حقیقت کے باوجود کہ میں خود جگر صاحب کا نادیدہ عاشق تھا کسی مشاعرے میں بھی ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کو ریڈیو پرن کران کے کلام اور ترجمہ دونوں کا عاشق تھا ایکن یہ زمانہ ان کی سرمستی کا زمانہ تھا اور آپ جانتے ہیں کہ شراب سے مجھے سخت نفرت ہے اب یہ اللہ کا کرم ہی تھا کہ میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۳۲ء میں کانپور کے کرائسٹ چرچ کالج کے مشاعرے میں ہوئی جب وہ شراب چھوڑ چکے تھے۔

؟

ع-م

کچھ اس ملاقات اور مشاعرے کے بارے میں مختصر طور پر فرمائیں۔ اس مشاعرے کی صدارت جگر مراد آبادی ہی کر رہے تھے۔ کالج کا مشاعرہ تھا۔ لوگ صرف اپنے پسندیدہ شاعروں کو ہی سننا چاہتے تھے مشاعرہ چلتا رہا، ہاں ایک بات بتانا بھول گیا کہ مشاعرے کی نظم وہی صاحب کر رہے تھے جو لکھنؤ کے مشاعرے میں بے انتہا ہوت ہوئے تھے اور مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب سامعین ادب سے گئے تھے تو انہوں نے میرا نام پکار دیا۔ میں جب صدر کے سامنے سے گزراتو وہ اک چھوٹے سے کاغذ کے پر زے پر کچھ نوٹ کر رہے تھے۔ ایک بار میری طرف دیکھا اور پھر مشغول ہو گئے۔ میں جیسے ہی ماٹک تک پہنچا کہ زور دار تالیاں بجیں۔ جگر صاحب چونکے کہ یہ کالج کا مشاعرہ اور یہ مولوی نما لڑکا بہر حال انہوں نے قلم بند کر کے جیب میں لگایا اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔ عارف مجھے اس وقت وہ غزل یاد نہیں آ رہی ہے بہر حال

ف-ن

جب کامیابی کے ساتھ غزل پڑھ کر میں جانے لگا تو دوسری غزل کی فرمائش ہو گئی لیکن میرے رقیب انا و نر نے مجھے دوبارہ نہیں بلا�ا تو جگر صاحب پڑھ کر خود مانگ پر آئے۔

”بھئی یہ کیا تماشا ہے کہ عوام بھی فنا صاحب کو دوبارہ سننا چاہتے ہیں اور میں بھی مشتاق ہوں آخراً اپ ان کو دوبارہ زحمت کیوں نہیں دے رہے ہیں؟“

جگر صاحب کے اس اعتراض کے بعد مجبوراً مجھے کو پھر بلایا گیا۔ دوسری غزل پڑھ کر جب میں جانے لگا تو جگر صاحب نے مجھکو اپنے پاس بٹھالیا۔ ان کا پہلا سوال تھا۔

جگر صاحب کیا آپ مولانا الیاس صاحب کی تبلیغی جماعت سے کوئی تعلق رکھتے ہیں؟  
جی نہیں۔

ف-ن ج-م  
پھر کیا مولانا مجد و ب صاحب سے کوئی قربت ہے؟  
جی وہ میرے مرتبی ہیں۔

ف-ن ج-م  
جی میں کانپور کا ہی ہوں لیکن آپ جہاں اکثر آتے ہیں وہ سب میرے مخالف ہیں۔

ج-م  
بڑے تعجب کی بات ہے۔ آپ اپنا پتہ نوٹ کرائیے میں کل خود حاضر ہو کر آپ کو دعوت نامہ دوں گا۔ کل شام ایک نشست ہے۔

ف-ن  
محترم میں جیران ہوں کہ ایک آفتاب لیکن مخدوزہ سے یہ کہہ رہا ہے، آپ جگہ بتا دیجئے میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔

اور پھر اس ملاقات کے بعد جگر صاحب سے میرے تعلقات ایک محبت کرنے والے بزرگ اور دوست جیسے آخری وقت تک قائم رہے۔ عارف میراڑ ہن تھک چکا ہے اس کو ختم کرو۔

ع۔ م

معاف فرمائیے صرف چند سوال اور۔ میں پھر ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان آپ کو لئے چلتا ہوں مجھے احساس ہے کہ اتنی پرانی باتوں کو یاد کرتے ذہن تھک گیا ہو گا۔ لیس یہ بتلائیے کہ اس وقت طرح نشستیں ہوتی ہوں گی تو آپ کے مخالفین تو مقابلہ پر ہی ہوتے ہوں گے؟

سوال کے دوسرے حصہ کا جواب نہیں دوں گا (پھر کچھ سوچ کر) ایک نشست مجھے یاد آ رہی ہے جو مولا ناصرت مولہانی کی صدارت میں ہوئی تھی۔ اس میں سب ہی موجود تھے۔ اس میں مصرع تھا:

”ادا کافر کی پیغامِ قضاء ہے“

نشست میں حضرت صاحب کے علاوہ کئی استاد شاعر تھے۔ ناطق لکھنؤی، سخا صاحب اور مقامی حضرات۔ میں نے غزل کہہ لی لیکن حافظ عبدالشکور صاحب کو نہیں دیکھا۔ ان سے یہی کہا کہ ابھی کہہ رہا ہوں۔ وہ پریشان تھے کہ حضرت صاحب کے سامنے نہ جانے یہ لڑکا کیا پڑھ دے۔ بہر حال جب میرا نمبر آیا تو حافظ جی کچھ ناراض سے دیکھا۔ پڑے میں نے مطلع پڑھا۔

نقاب روئے روشن جب اٹھا ہے نگا ہوں کو پسینہ آ گیا ہے اور شعر یاد نہیں آ رہے ہیں۔ دوسرے دن شہر میں نشست کے بھی چرچے تھے اور میں بطور شاعر مان لیا گیا۔

آپ کے ہم عصر شعراء؟

ع۔ م

دیکھئے میں سارے نام گناہ نا شروع کروں اور کوئی رہ جائیگا تو شکایت ہو گی ہاں کچھ مخصوص نام حاضر ہیں جیسے دورہ اشمی، نشور واحدی، (پہلے وہ بھی مولوی تھے میری طرح) وفا شاہجہان پوری، ندرت کانپوری، شارق ایرانی وغیرہ۔ ثاقب صاحب کا نام اسلئے نہیں لیا کہ ان کی شخصیت شعراء سے ہٹ کر تھی وہ الفاظ کے شاعر تھے۔

ع۔م آپ کے پسندیدہ شاعر جگر صاحب کے علاوہ کون کون ہیں؟  
ف۔ن فہرست لمبی ہے دو چار نام لئے لیتا ہوں۔ مجروح بہت پسند ہیں۔  
وضع قطع اور مزاج ہر اعتبار سے خمار بارہ بنکوی، میں نظم عام طور پر  
نہیں پسند کرتا لیکن ساحرا اور کتفی اعظمی پسند ہیں۔ ہاں رباعیات پسند  
کرتا ہوں اور خود بھی رباعی کے جتنے اوزان ہیں سب میں رباعیات  
میں نے کہی ہیں۔

ع۔م کانپور کے نوجوان شعراء میں کون پسند ہے؟  
ف۔ن پہلا نام قوم ناشاد۔ زیب غوری (جو بعد میں بہک گئے) رمزیتا پوری  
وغیرہ۔

ع۔م ایک مشکل سوال۔ آپ نے اب تک اپنا مجموعہ کلام کیوں نہیں شائع  
کرایا؟

ف۔ن عارف تم کو یاد ہے کہ ہم لوگ ایک دن بیکن گنج بازار سے گزر رہے  
تھے تو فٹ پاٹھ پر ایک کباڑی کی دکان پر کانپور کے ایک استاد شاعر  
کے مجموعہ کلام کی دس بارہ جلدیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ مجموعہ شاید  
ایک سال قبل شائع ہوا تھا۔ بس میں نے اسی دن طے کر لیا تھا کہ  
جہاں اردو کا قاری اتنا بے حس ہو جو صرف مفت کی کتابیں پڑھنا چاہتا  
ہو وہاں میرا مجموعہ نہیں شائع ہوگا، ویسے تم جانتے ہو کہ مکمل قلمی مجموعہ  
تیار رکھا ہے۔ (یہ بات صحیح ہے: ع۔م)

ع۔م آپ کو لوگ بد مزاج کہتے ہیں؟  
ف۔ن صحیح کہتے ہیں کیونکہ میں صاف گو ہوں۔ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ میرا  
ذریعہ معاش شاعری ہے۔ مقامی نشتوں کیلئے کبھی میں نے کوئی  
فرماں ش نہیں کی صرف وقت کی پابندی چاہتا ہوں اگر دس بجے کا  
وقت دیا تو پونے دس بجے تیار ہو جاتا ہوں۔ وقت گذرنے کے بعد

دس منٹ مزید انتظار کرتا ہوں لیکن اگر کوئی لینے نہیں آیا تو شیر و انی اتار کر پروگرام کینسل۔ پھر کوئی طاقت مجھے نشست میں نہیں لے جاسکتی ہے۔ یہی میری بد مزاجی ہے اگر مجھے بلا ناچاہتے ہیں تو میرے مزاج کو سمجھیں۔ میں عوام کا شاعر ہوں عزت کے ساتھ فٹ پاٹھ پر بیٹھ کر پڑھ سکتا ہوں لیکن بنگلہ یا کوٹھی والا اگر صرف اپنے ملازم کو بھیج کر نشست کی اطلاع دیتا ہے تو میں ہرگز نہیں جاتا۔ بد مزاجی مشہور کی گئی ہے ہوں نہیں۔

کیسٹ پھر ختم ہو گیا اور حکم ہوا کہ اب اس کو بند کرو۔

ع-م      اب تو مجبوری ہے۔ پھر بھی اجازت دیں تو چند باتیں نوٹ کر لوں۔  
ف-ن      ورنہ یہ انٹرو یا دھورا رہ جائے گا۔

ع-م      بس دس پندرہ منٹ سے زیادہ اب برداشت نہیں کر سکتا۔ پوچھئے جناب۔

ع-م      آپ اصول پسند ہیں یہ عام خیال ہے لیکن میں نے کبھی کبھی آپ کے اصول ٹوٹتے بھی دیکھے ہیں؟

ف-ن      ہاں اگر کوئی بہتر اصول سامنے آگیا تو میں اپنا اصول توڑ بھی دیتا ہوں۔  
        اصول ہم خود بناتے ہیں اس میں کوئی قباحت نہیں۔

ع-م      جدید شاعری کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

ف-ن      مجھے جدیدیت سے چڑھنے ہے اگر اصول و قواعد کے ساتھ نئے ڈھنگ سے شعر کہا جائے تو مجھے پسند ہے۔ جیسے کسی کا شعر ہے کہ:

گھر سے نکلے ہیں آنسوؤں کی طرح  
واپسی کا کوئی سوال نہیں

یا پھر اپنے اشہر قد والی کا شعر:

دھوپ کہتی ہے کہ رفتار بڑھائے رکھئے اور سائے ہیں کہ دیوار ہوئے جاتے ہیں

آخرِ نظمی کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے:  
 اک آدمی کی بڑی قدر ہے مرے دل میں  
 بھلا تو وہ بھی نہیں ہاں مگر بُرا کم ہے  
 وغیرہ وغیرہ مجھے اس طرح کے جدید شعرا پسند ہیں۔

ع-م محترم اب میں اس انش رو یو کے اختتام سے پہلے اپنی سرحدوں سے  
 آگے بڑھ کر ایک سوال کی اجازت چاہتا ہوں۔ مسکرائے ”چلنے اجازت  
 ہے“

جناب آپ آخر چیز کیا ہیں؟ میں نے آپ کوئی بار نماز پڑھنے کے  
 دوران زار و قطار روتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور دوستوں کی محفل  
 میں رات بھرتاش کھلتے ہوئے بھی۔ شاعر اور شراب آجکل لازم و  
 ملزم ہے لیکن آپ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ ایک بار مجھے یاد  
 ہے کہ آپ نے ایک رات تقریباً بارہ بجے دادا میاں کے چورا ہے  
 پر صرف چندر کشہ والوں کی فرمائش پرف پاتھ پر بیٹھ کر غزل پڑھنا  
 شروع کر دی حتی کہ کچھ لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے۔ سب  
 حیران کہ فنا نظامی کو کیا ہو گیا ہے۔ غزل ختم کر کے آپ نے خود ہی  
 حیرانی دور کر دی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ اس سرد موسم میں آپ لوگوں  
 کو اپنے گرم بستر وں کو چھوڑ کر باہر آنا پڑا۔ اصل میں آج میں نے  
 ایک رئیس کے بنگلہ کی نشست کی دعوت ٹھکرای دی کیونکہ انہوں نے  
 نشست کی اطلاع اپنے میجر کے ذریعہ کھلا دی تھی۔ کیا ایک رقعہ بھی  
 نہیں بھیج سکتے تھے؟ آپ کو یہ واقعہ یاد ہے؟

(نوٹ: دوسرے دن ان صاحب نے خود فنا صاحب کے گھر پر آ کر معذرت کی۔ غلطی  
 میجر کی تھی اس نے رقعہ کہیں کھو دیا تھا۔)

ف-ن ہاں یاد ہے۔ عارف صاحب آخر آپ کا سوال کیا ہے؟

ع۔م

صرف یہ کہ آپ کی شخصیت کے اور کتنے پہلو ہیں؟  
ف۔ن ایک شعر ن لیجئے اور پھر اس خرافات کو ختم کیجئے۔ مجھے بہت پسند ہے  
یہ شعر:

مجھ سے صدر نگ کو دنیا نہ سمجھ پائی کہ میں  
حرف تکفیر بھی تھا نعروہ تکبیر بھی تھا

ع۔م سبحان اللہ آپ کی پوری شخصیت اس میں سمٹ آئی ہے۔ کس کا شعر  
ہے؟

ف۔ن شاید شمس الرحمن فاروقی کا ہے۔ بس اب قلم بند کیجئے۔  
جی بہت بہت شکر یہ۔

مودودی ۱۰ ستمبر ۲۰۰۲ء



# فنا ناظامي

ڈاکٹر سید سعید احمد

کراچی

مشرق وسطیٰ اور دنیا کے دوسرے خطوں میں جہاں اردو بولی اور بھجی جاتی ہے فنا ناظامي کا نپوری کے نام آشنا ضرور ہوں گے۔ فنا کی شہرت جغرافیائی اور سیاسی حد بندیوں کو توڑ چکی تھی۔ وہ کانپور کے مشاعروں میں تو کم ہی دکھائی دیتے تھے لیکن بھارت کے طول و عرض، پاکستان اور دیگر ممالک کے بڑے مشاعروں میں ان کی موجودگی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی تھی۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ شہر کے مشاعرے میں بطور سامع موجود ہوتے تھے لیکن منہ پر کپڑا لپیٹھے ہوتے تھے تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔ وہ مشاعروں میں تقدیم و تاخیر کی پرواکے بغیر شروع ہی میں غزل پڑھ لیتے تھے حالانکہ مشاعروں کے منتظمین یہ چاہتے تھے کہ وہ آخر میں پڑھیں کیونکہ ان کے پڑھتے ہی مجمع چھٹنے لگتا تھا۔ ان کی اس مقبولیت کی وجہ ان کا تغزل، رنگینی کمال، تازہ کاری، سریع الفہم اور معنی آفریں اشعار کے علاوہ ان کی مترجم ادائیگی بھی تھی۔ وہ جب اپنی غزل پڑھتے تھے تو مجمع میں ایک سماں بندھ سا جاتا تھا۔ سامعین نے کبھی ایک غزل پر اکتفانہ کی ہمیشہ مکر اور سہ کر رپڑھوایا گیا۔ فنا ان شاعروں میں تھے جنہوں نے اپنے تخلص کے ساتھ ”کانپوری“ کا لاحقہ استعمال کر کے اس شہر کی ادبی حیثیت کو متعارف کرایا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا انہیں بیرون جات کے مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے کانپور میں رہنے کا کم اتفاق ہوتا تھا اور اس کا انہیں احساس بھی تھا جس کو

انہوں نے اپنے شعر میں یوں ظاہر کیا:

تبليغ غم کی خاطر پھرتے ہیں مارے مارے

ہوتا نہیں میر اب کانپور رہنا

فائز نظامی کانپوری کا اصل نام مرز اشٹار بیگ تھا۔ و ۱۹۲۵ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم حاصل کی۔ یہیں شعرگوئی سے شغف پیدا ہوا اور مشاعروں میں شرکت ہونے لگی۔ بہت سادگی پسند اور دیندار آدمی تھے۔ جوانی ہی سے باریش تھے۔ انگریزی لباس کبھی زیب تن نہ کیا۔ شیر و انبی اور پاجامہ ان کا مخصوص پہناؤ تھا۔

چونکہ خوش پوش تھے اس لئے شیر و انبیوں سے الماریاں لبریز ہوتی تھیں۔ نماز، روزہ اور دیگر دینی امور کے پابند تھے۔ حالانکہ ریاض خیر آبادی کی طرح اشعار میں میخانہ، ساقی، جام اور شراب کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ ایک مرتبہ کراچی کے کل ہندوپاک مشاعرہ میں جو ۱۹۶۲ء میں جگر صاحب کی یاد میں منعقد ہوا تھا انہوں نے جوش صاحب کو مخاطب کر کے ایک قطعہ پڑھا تھا جس کا دوسرا شعر یہ تھا:

میں شرابی نہیں ہوں شاعر ہوں

اصطلاحاً شراب پیتا ہوں

تو جوش صاحب سخت ناراض ہوئے اور انکی غزل ختم ہوتے ہی ماںیک پر تشریف لائے اور برجستہ کہا:

میں شرابی نہیں ہوں ملٹا ہوں

وہ دوسرا مصروعہ پڑھنا چاہتے تھے کہ شوکت تھانوی مرحوم نے جو نظمت کے فرائض انجام دے رہے تھے نہایت ادب سے التجا کی کہ آپ اپنی جگہ واپس آ جائیں اور اپنے مقام پر پڑھیں۔ جوش صاحب بمشکل تمام راضی ہوئے۔

فنا، جگر اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ جگر صاحب نے انہیں ڈھاکہ کے مشاعرے میں جو غالباً ۱۹۵۰ء کی دہائی میں منعقد ہوا، سناتھا اور ان کی غزل بہت پسند

کی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

حسن ہے یوں پریشان پریشان  
جیسے لٹ جائے رستے میں رہن

اور اس کے بعد فنا کے نیاز مندانہ تعلقات جگر صاحب سے قائم ہو گئے۔ فنا کا ترجمہ الواقع بڑا دلاؤیز تھا۔ وہ شعر کچھ یوں پڑھتے تھے کہ ہر خاص و عام لطف انداز ہوتا تھا۔ وہ شعر پڑھنے سے پہلے اس کا پس منظر اور تلمیحات بھی بیان کردیتے تھے۔ اس طرح عام سامعین کو شعر سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ترجمہ سے پڑھنے کے باوجود وہ ترجمہ کو شاعر کیلئے لازمی نہیں قرار دیتے تھے۔ اپنے ان خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

کچھ ذوق سلیم اپنے میں پیدا کیجیے  
یوں حسن سماعت کو نہ رسوا کیجیے  
عظمت مجھے تسلیم ترجمہ کی مگر  
گانا ہی نہیں شعر بھی سمجھا کیجیے

فنا کی بعض غزلیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ زبانِ زد خاص و عام ہو گئیں۔ حتیٰ کہ بعض ثقہ قسم کے ناقدین اور ”ترقی پسند“، اہل الرائے بھی جو فنا کو محض مشاعروں کا شاعر مانتے تھے، ان کی غزلیں گنگنا تے ہوئے ملتے تھے۔ ان کی یہ غزل لفظی و معنوی خوبیوں، جدید تشبیہات و استعارات اور تقسیم ہند کے بعد کے سیاسی حالات کے پس منظر میں ایک حسین تخلیق کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گی:

گھر ہوا گلشن ہوا صحراء ہوا  
ہر جگہ میرا جنوں رسوا ہوا  
میں تو پہنچا ٹھوکریں کھاتا ہوا  
منزاوں پر خضر کا چرچا ہوا

غیرت اہل چمن کو کیا ہوا  
 چھوڑ آئے آشیاں جلتا ہوا  
 غم سے نازک ضبط غم کی بات ہے  
 یہ بھی دریا ہے مگر ٹھہرا ہوا  
 یہ عمارت تو عبادت گاہ ہے  
 اس جگہ اک میکدہ تھا کیا ہوا  
 اس طرح رہبر نے لوٹا کارواں  
 اے فنا رہن کو بھی صدمہ ہوا  
 فنا کا یہ شعر بھی قبول عام کی سند پاچکا ہے:

ترے وعدوں پہ کہاں تک مرادل فریب کھائے  
 کوئی ایسا کر بہانہ مری آس ٹوٹ جائے  
 ان کی یہ غزل بھی بہت مشہور ہوئی:

جب بھی بیٹھا ہوں دامن کو سینے  
 مجھ کو چھیڑا ہے دیوانگی نے  
 جانے کیا کہہ دیا ہے صانے  
 ہو گئے چاک کلیوں کے سینے  
 دیکھ کر میرے اشک ندامت  
 ان کی رحمت کو آئے پسینے

ان کے کلام میں زبان کی شیرینی و حلاوت کے ساتھ ساتھ نئی نئی تشبیہات  
 اور محاورے بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:

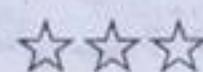
ہم گلشن فطرت سے جینے کی ادا لیں گے  
 شاخوں سے چک لیں گے کانٹوں سے انا لیں گے

لفظ ”انا“ پر یاد آیا کہ خود ان کی شخصیت بھی ”انا“ اور ”انساز“ کا مرکب تھی۔

انہیں یہ بات قطعی ناپسند تھی کہ جس وقت کوئی شاعر شعر پڑھ رہا ہوا س وقت چائے، پان وغیرہ تقسیم کئے جائیں۔ ایک مرتبہ کراچی جیم خانہ کلب کے مشاعرے میں جو ۱۹۸۵ء میں منعقد ہوا تھا اور جس میں نظمت کے فرائض محسن بھوپالی ادا کر رہے تھے۔ فنا صاحب کی غزل کے دوران وحید الحسن رضوی (ایک ممتاز سماجی کارکن جن کا تعلق کانپور سے ہے) حاضرین کو چائے، پان وغیرہ پیش کرنے لگے۔ فنانے ناراضگی کا اظہار کیا۔ جب انہوں نے کچھ کہا تو فنانے بر جستہ جواب دیا ”وحید صاحب سب کو پان نہ کھلایا کیجئے۔ بیٹھ کر شعر سنیں۔ آپ تو سخن فہم ہیں اور پھر کانپور کے ہیں، کانپور میں تو ایسے خوشامدی لوگ نہیں ہوتے“ یہ سنتے ہی وحید صاحب فوراً بیٹھ گئے۔

فنانے ساری زندگی شعروادب کی خدمت میں بسر کی۔ اردو غزل کو بلندی فکر اور حسن ادائیگی سے آراستہ کیا۔ ایک سے ایک بڑھ کر مرصع غزلیں کہیں۔ ان کو برصغیر کے طول و عرض میں پہنچایا اور مقبول بنایا۔ یہ بجائے خود اردوادب کی بہت بڑی خدمت ہے۔ انکسار اتنا تھا کہ کچھی مجموعہ کلام شائع کروائے کے صاحبِ دیوان کہلانا پسند نہ کیا۔ ان کا قول تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ فن کے درمیان میری حیثیت ایک مبتدی کی ہی ہے۔ میں کس لئے دیوان چھپواؤں۔ نہ ہے کہ اب ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مجموعہ کلام شائع کروارے ہے ہیں۔ ذیل میں ان ہی کے دو شعروں پر یہ تذکرہ ختم کرتا ہوں:

ترک تعلقات کو اک لمحہ چاہئے  
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا  
کچھ یوں چمک رہا ہے مر نقشِ پافنا  
جیسے ہو راستے میں کوئی آئینہ پڑا



# فنا نظامی..... ایک شاعر ایک عہد

عشرت ظفر

105/654 فہیم آباد کالونی کانپور

یادش بخیر! فنا نظامی کا نام میں نے سب سے پہلے ۱۹۵۲ء میں سنا، اس وقت میری عمر صرف دس سال تھی۔ میں قصبه رسولی (ضلع بارہ بنکی) کے مدرسہ مدینۃ العلوم میں زیر تعلیم تھا۔ میرے جس ہم جماعت نے مجھے فنا صاحب کے نام سے متعارف کرایا تھا اس نے مجھے ان کے یہ دو شعر نئے تھے جواب تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں:

دلِ عشق میں ہوتا ہے مائل بہ فغاں پہلے  
جب آگ سلکتی ہے اٹھتا ہے دھواں پہلے  
ہم اپنے نشیمن کے انجام سے واقف ہیں  
یا برقِ تپاں آخر، یا برقِ تپاں پہلے

پھر جب میں نے ۱۹۵۶ء میں لکھنؤ میں بودو باش اختیار کی تو ایک آل انڈیا مشاعرے میں میں نے جناب فنا نظامی و جناب نشور واحدی دونوں کو دیکھا بھی اور پڑھتے ہوئے بھی سن۔ نشور صاحب کا نام میں نے بہت کم عمری میں والد محترم کی زبان سے سنا تھا۔ اور والد کے پاس ان کا ایک شعری مجموعہ بھی دیکھا جسے میں اکثر پڑھتا تھا مگر، بہت کچھ میری سمجھ سے باہر تھا لیکن شعروخن سے دلچسپی میری مجبوری تھی۔ اس آل انڈیا مشاعرے میں فنا صاحب نے جو غزل پڑھی تھی اس کے دو شعر مجھے یاد رہ گئے:

یہ بہار کا زمانہ، یہ حسیں گلوں کے سائے  
مجھے ڈر ہے با غباں کو کہیں نیند آنہ جائے

میں چلا شراب خانے جہاں کوئی غم نہیں ہے  
جسے دیکھنی ہو جنت مرے ساتھ ساتھ آئے

بعد از ۱۹۶۲ء میں جب میں نے کانپور میں بودو باش اختیار کی پھر کم و بیش ۱۹۸۵ء تک میں نے ان کا کلام مختلف ادبی محفلوں اور مشاعروں میں سنا، مجھے ان سے بہت قربت نہیں تھی لیکن جگرا کادمی کے دفتر یا پھر کسی ادبی نشست میں ان سے کچھ گفتگو ضرور ہو جایا کرتی تھی۔ فا صاحب اپنا کلام شائع کرانے کے حق میں کبھی نہیں رہے نہ تو شعری مجموعے کی شکل میں اور نہ رسائل و اخبارات میں لیکن ایسا نہیں ہے کہ رموز و فن شاعری سے واقف نہیں تھے یا ان کا کلام صحت مند نہیں ہے، ان کا خیال تھا کہ ان کی شاعری ان کیلئے محض ذریعہ معاش ہے اور اسے بہت اعلیٰ شاعری کے زمرے میں رکھا نہیں جا سکتا۔ یہ نظریہ دراصل ان کے وسیع المطالعہ ہونے اور منفرد شعری شعور کی غمازی کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے ان کی شاعری کا کچھ حصہ تو ایسا ہی ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے ان اصحاب سے شدید اختلاف ہے جو ان پر محض مشاعرے کا شاعر ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ اپنے خاص فکری محوں میں فنا نظامی شعر کی بساط پر گہرے نقوش مر تم کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔

فنا نظامی نے اپنی شاعری کو ذریعہ معاش بنایا مگر صحت مند و پُر تاشیر شاعری بھی کی، عصری واقعات و حالات پر ان کی گرفت سخت رہتی تھی، ان کا مطالعہ مکمل تھا اور مشاہدہ بھی، سیاسی تبدیلیوں پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتے تھے، مشاعروں کے حوالے سے اگر دیکھیں تو وہ بے حد با اصول شاعر تھے۔ کیا مجال تھی کہ وہ اپنے اصول اور وقار کے خلاف کوئی سمجھوتہ کر لیں۔ زمانے نے ان کے اصولوں کی قدر بھی خوب کی، انہوں نے اس بنیاد پر اپنی بات ہمیشہ منوائی اور شہرت کی بلندیوں تک گئے۔ ارباب علم و دانش کے طبقے میں بھی بہت مقبول ہوئے۔ وہ رموز و فن شعر سے خوب باخبر تھے اور اکثر اپنے معاصرین کے ساتھ بحث و مباحثہ میں مصروف پائے جاتے تھے۔ ان کے معاصرین بھی خوب انہیں سمجھتے تھے اور قدر بھی کرتے تھے کہ وہ صرف مشاعروں تک محدود نہیں ہیں

اعلیٰ ادبی بحثوں کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور موشگان فیاں بھی کر سکتے ہیں، انگلی نیازمندی اپنے بزرگوں کے تیس بھی مسلم تھی اور اب یہ دولت تو تقریباً ختم ہی ہو چکی ہے، انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں ایک جگہ کہا بھی ہے:

کچھ ذوقِ سلیم اپنے میں پیدا کیجیے  
یوں حسنِ ساعت کو نہ رسوا کیجیے  
عظمت مجھے تسلیمِ ترنم کی، مگر  
گانا ہی نہیں شعر بھی سمجھا کیجیے

مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ آج بھی کانپور کے بیشتر شعراً عالمی مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں مگر اربابِ علم کی محفلوں میں بیٹھنے اور بات کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، مجھے یاد ہے کہ آج سے کم دبیش پچیس سال قبل مشاعروں کا ایسا دور تھا جس میں شرکت کرنے والے شعراً مخصوص عوام کی ضیافتِ طبع کا سامان فراہم نہیں کرتے تھے بلکہ شعر کی باریکیوں اور فنی معايَب و محاسن پر بھی اظہارِ خیال کرتے تھے مگر آج تو شعراً خود اپنے ہی تخلیق کردہ شعر کے معايَب و محاسن نہیں بتا سکتے۔ فنا صاحب کے معاصرین میں کانپور اور بیرون کانپور بیشتر ایسے شاعر تھے جو فنی رموز پر خوب بولتے تھے۔ میں نے تو وہ محفليں بھی دیکھی ہیں جو گرانڈ ہوٹ مول گنج میں منعقد ہوتی تھیں اور گھنٹوں بحث و تمجیص کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ فنا نظامی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے میں ان سطور کے لئے معدرت خواہ نہیں ہوں۔ اس ضمن میں کچھ شعر دیکھیں:

اک تشنہ لب نے بڑھ کے جو ساغر اٹھا لیا  
ہر بولہوں نے میکدہ سر پر اٹھا لیا  
غیرتِ ابل چمن کو کیا ہوا  
چھوڑ آئے آشیاں جلتا ہوا  
ترکِ تعلقات کو اک لمحہ چاہئے  
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا

چشمِ اہلِ فن میں اپنے فن کی مستی کیوں نہیں  
بتگروں کے دل میں ذوقِ بت پرستی کیوں نہیں  
چہرہ صبح نظر آیا رُخِ شام کے بعد  
سب کو پہچان لیا گردشِ ایام کے بعد

ان اشعار میں عصری کروٹیں ہیں۔ سیاسی منظر ناموں کے شعری پیکر بھی ہیں۔

زوال پذیر اقدار کا نوحہ بھی ہے۔ عرفان ذات بھی، شکایات و سوالات بھی ہیں۔ یہ سب شاعر کا بڑا کارنامہ ہے لیکن جمالیات کے حوالے سے اگر بات کریں تو فنا نظامی کی غزل میں وہ سب کچھ ہے جس میں حسن کی جلوہ آرائی بھی ہے اور عشق کا گداز بھی، وہ جس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں وہاں ادب اور انکساری ایک خاص شیوه تھی، ہی رنگِ تغزل کے حوالے سے انسانی جذبات کا ایک سیلِ رواں ہے جو لفظوں میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ فنا کے رنگِ سخن کے تاروپود کو اگر دیکھا جائے تو ان کے یہاں حرث، فائی، اصغر و جگر کا امتزاج وابہتاج ملتا ہے، کلا سیکی غزل کے یہ وہ اسکوں ہیں جن کے چراغ غیر فانی ہیں۔ جن شعرا کو یہاں سے استفادہ و اکتساب کا مقدور رہا ہے وہ اسے محسوس کرتے ہیں، حالانکہ اس زمانے میں اسکا فقدان ہے کیونکہ مکتب و مستفید ہونے کی منزلِ حصول علم کے بعد آتی ہے اور اس کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہے، فنا نظامی نے جس مکتب فکر میں تعلیم حاصل کی اس نے ان کے چراغ کی لوہی شہ سرخ رکھی اور انہوں نے خود بھی اس کا وقار قائم رکھا۔ چند اشعار دیکھئے:

غم سے نازک ضبطِ غم کی بات ہے  
یہ بھی دریا ہے مگر ٹھبرا ہوا  
ہم گلشنِ فطرت سے جینے کی ادائیں گے  
شاخوں سے پک لیں گے کانٹوں سے آنالیں گے  
تو پھول کی مانند نہ شبغم کی طرح آ  
اب کے کسی بے نام سے موسم کی طرح آ

لطفِ فراقِ یار نے لذتِ انتظار نے  
 دورِ دل و نگاہ سے شوقِ وصال کر دیا  
 ساحل کے تماشائی ہر ڈوبنے والے پر  
 افسوس تو کرتے ہیں امداد نہیں کرتے  
 دل دھڑک دھڑک انھا یوں کسی کو دیکھ کر  
 جس طرح بہار میں نبضِ گلتاں چلے  
 سر رکھ کے ترے پاؤں پہ ہم کرتے ہیں شکوہ  
 کچھ لوگ اسے سجدہ شکرانہ کہیں گے

فنا نظمی کے یہاں جدید و قدیم کا ایک خاص توازن ہے حالانکہ انہوں نے  
 اس جدیدیت کو بھی قبول نہیں کیا تھا جو بیسویں صدی کے نصف آخر کے آغاز میں  
 نمودار ہوئی تھی، حالانکہ وہ شروع میں ترسیل کے الیے کاشکار رہی لیکن رفتہ رفتہ اس کے  
 خدوخال نمایاں ہوئے اور پھر یہ ایک مستحکم اور تو انا لہجہ اختیار کر گئی لیکن فنا نظمی نے  
 نظریات کے حوالے سے ترقی پسندیت کو قبول کیا تھا، حالانکہ اس کا اظہار انہوں نے  
 کبھی نہیں کیا لیکن انکے اشعار سے یہ کیفیت متریخ ہے لیکن قدیم کا دامن انہوں نے  
 کبھی نہیں چھوڑا اور اسی رنگِ ختن کے دلدادہ رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۵ء میں جب  
 نئی غزل کا نپور میں متعارف ہوئی، نوجوان شعراء نے اسے قبول کیا مگر فنا نظمی نے اس  
 سے انحراف کیا، اس زمانے میں نوک جھونک کے مناظر بھی خوب دیکھے گئے، وہ جس  
 رنگ کے شیفہ و شیدا تھے اسی کے حامی رہے۔ دیکھئے:

یوں انتقامِ تجھ سے فصلِ بہار لیں گے  
 پھولوں کے سامنے ہم کا نٹوں کے پیار لیں گے  
 دیوانہ نہ کر ڈالے تجھ کو تریٰ تہائی  
 غیروں سے نہ مل لیکن آئینہ تو دیکھا کر

ساقیا تو نے مرے ظرف کو سمجھا کیا ہے  
زہر پی لوں گا ترے ہاتھ سے صہبا کیا ہے  
میرے جنوں کو زلف کے سائے سے دور رکھ  
رستے میں چھاؤں پا کے مسافر ٹھہرنا جائے

فنا نظامی کا اصل نام مرزان شارعی بیگ تھا۔ ۱۹۲۲ء کو کانپور، ہی کی سر زمین پر  
اس جہاں آب و گل میں وارد ہوئے تھے اور ۱۸ جولائی ۱۹۸۸ء کو اسی سر زمین پر  
انہوں نے آخری سائنس لی اور کانپور، ہی کی خاک میں آسودہ و آرام گیر ہیں۔ بقول میر  
پھرنا آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ

غالباً زیرِ زمیں میر ہے آرام بہت  
ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ کانپور میں بہت کم قیام کر پاتے تھے۔ بیرون  
کانپور، ہی نہیں بلکہ بیرون ملک مشاعروں میں ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ غالباً ایسے ہی کسی  
موقع پر انہوں نے یہ شعر کہا تھا:  
تبليغ غم کی خاطر پھرتے ہیں مارے مارے  
ہوتا نہیں میسر اب کانپور رہنا

فنا نظامی کے ساتھ ہی ایک عہد بھی غروب ہو گیا۔ زمانے نے ساری آب و  
تاب چھین لی ہے لیکن ہماری تمام عقیدتیں ان سے وابستہ ہیں۔ اس موقع پر جناب  
پیام فتح پوری مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے:

کیا لوگ تھے کہ راہِ وفا سے گزر گئے  
جی چاہتا ہے نقشِ قدم چو متے چلیں



# فنا نظمی

ایک ہمہ جہت شخصیت

از۔ ناظر صدیقی  
جزل سکریٹری... ادبی عالم کا پنور

اپنے ابتدائی تیس چالیس سال زندگی خود کو سجائے سنوارنے میں خرچ کرتی ہے اور پھر ہم اپنی اسی کمائی کو منزل پہ منزل دھرتے اور چھوڑتے چلے جاتے ہیں اور زندگی کے باقی ماندہ روز و شب شہر آرزو کے ماتم اور نوحہ خوانی میں گزر جاتے ہیں۔ عام طور پر انسانی زندگی اسی لئے اور دھن پر بسر ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے غنفوں شباب میں جو کچھ اپنے گرد جمع کرتے ہیں، اس کا ماتم کتنا جانکاہ ہوتا ہے اس سے ہم اچھی طرح واقف ہیں کیونکہ یہی ہزاروں سال سے انسانی زندگی کا دورانیہ ہے..... جسم و جاں کو کھنڈر بننے میں کم و بیش اتنا ہی وقت لگتا ہے جتنا اسے سجائے میں لگتا ہے۔ اب عالم یہ ہے کہ ہر آنے والی صحیح اپنے دامن میں داغِ مفارقت کے چھوٹے بڑے پرچم ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ آوازوں اور یادوں کی عمارت مسماں ہو رہی ہے۔ سکوتِ شہر جاں کا یہ منظر کتنا عبرت ناک ہے۔ ہماری فکر سا اس تصور کو طرح طرح پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی کہتی ہے

جنہیں ہم دن کے ہنگاموں میں اکثر بھول جاتے ہیں  
وہ چہرے شب میں کرتے ہیں سوال آہستہ آہستہ

اور کبھی کہتی ہے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لیم

تیرے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا ہوئے؟

مگر ہم بھی تمام ٹوٹے بکھرتے لمحوں کو اپنے جسم کے مقبرے میں محفوظ کر کے  
اپنی شکست خور دگی کو چھپاتے ہوئے کہتے ہیں۔

ایک ایک یادِ عمر کا حاصل کہیں جے

وہ خلوتِ خیال کہ محفل کہیں جے

رنگ و نور اور بلند قامتی کے مجھ سے مرزا شارعی بیگ فنا نظامی سے میری ملاقات  
کب اور کیسے ہوئی، اسے یاد رکھنا ممکن نہیں..... جزیرے زندگی کے سمندر میں  
ڈوبتے اُبھرتے رہتے ہیں لیکن کون یاد رکھتا ہے کہ یہ جزیرے کب اُبھرے تھے اور  
کب ڈوب گئے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ہم ایک بھی ہوئی محفل میں تھے اور وہاں فنا  
نظامی کا چراغ نہایت آب و تاب سے روشن تھا۔ یہ محفل گردشِ روزگار کی طرح اپنا تختہ  
کبھی ناظر کی گلی میں اتار دیتی تھی اور کبھی شارق صاحب کی نشت گاہ (جگرا کا دمی)  
میں برا جہان کر دیتی تھی محفل کی اس گردش میں گرانڈ ہوٹل اور نئی سڑک کا مخصوص چائے  
خانہ بھی شامل تھا..... میں فنا صاحب سے اس وقت قریب ہوا جب ان کی شہرت،  
آواز، بذله سنجی، ذہانت اور ممتازت اپنے انتہائی نقطہ کمال پر تھی۔

فنا صاحب محصور ہو کر بیٹھنے والوں میں نہ تھے۔ بیرونی مشاعروں کے سلسلے  
میں شہر سے غائب ہونا الگ بات تھی لیکن شہر میں رہ کر وہ بادی یہ پیکائی کے سے انداز میں  
شہر کو اور شہر کے مانوس حصوں کو اپنے ہلکے ہلکے جو توں اور مخزوٹی انگلیوں جیسی چھڑی سے  
ناپتے اور روندتے رہتے تھے..... وہ بیٹھنے میں متھر ک دکھائی دیتے تھے اور چلتے یوں  
تھے کہ لگتا تھا کہہ رہے ہوں۔

میری رفتار سے بھاگے ہے بیباں مجھ سے

چال کڑی کمان کا تیر تھی۔ ایسا سیدھا چلتے تھے کہ بلند قامت دکھائی دینے  
لگتے تھے..... دوستی، شناسائی اور ایک دوسرے پر منے کے لمحے کیسے طے ہو جاتے  
ہیں ان پر غور کرنے کا موقع مجھے کیا آج تک کسی کو بھی میرنہ آسکا..... شناسائی ایک  
جان اور دو قلب میں ہمیں کب بدل دیتی ہے اس کا یورا شاید کوئی نہ دے سکے۔

پھر یوں ہوا کہ ہر اتوار کو دن میں اور کام کے دنوں میں شام کے وقت اکثر میرے ڈرائیور میں تشریف لانے لگے جہاں راقم الحروف کے علاوہ عارف محمود صاحب اور اشهر قد والی ان کے استقبال کیلئے موجود رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ دیگر احباب کو اس کا علم ہو گیا۔ لہذا جلیل صاحب، سحر صاحب، زیر شفائی وغیرہ بھی موجود رہنے لگے اور میرا کمرہ گہوارہ علم و ادب بن گیا۔ اکثر یہ محفوظ جلیل صاحب کے کمرے میں اور بھی دیگر احباب کے ساتھ گرانڈ ہوٹل میں منتقل ہو جاتی تھی۔ ہر جگہ کچھ چہرے بدلتے تھے۔ گرانڈ ہوٹل ندرت صاحب کے گھر سے قریب تھا وہاں وہی جانِ محفوظ ہوتے تھے اور اپنی خوش کلامی اور چھیڑ خانی سے ایک طوفان ہمه وقت زندہ رکھتے تھے۔ گرانڈ ہوٹل کا ان لطافت اور جانِ لطائف تھا۔ یہاں چہلمیں، فقرے بازیاں، نظر و تعریض اور بھی کبھی تشنج کا حملہ بھی ہوتا رہتا تھا۔

مقامی اور بیرونی مشاعرے فنا صاحب کی شخصیت اور شاعرانہ وقار کے گرد گھونٹنے لگے تھے۔ آج جب میں فنا صاحب کے بارے میں سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کتنے محلوں، مسکنوں اور چوکھوں کے اسیر تھے۔ وہ عالم تو نہیں تھے لیکن علم کے شیدائی ضرور تھے۔ دادا میاں کی خانقاہ ہو، ثاقب صاحب کا ججرہ ہو، مولوی یوسف صاحب ہوں یا بکر منڈی میں صوفی صاحب کا قیل و قال یا قوالی کا جشن ہو ہر جگہ فنا صاحب موجود رہتے تھے۔ فنا صاحب میں نیازمندی بالکل نہ تھی کیونکہ وہ استغنا اور شان بے نیازی کے جیتا جا گتا مظہر تھے مگر دو شخصیتیں ایسی تھیں کہ جہاں انہیں بھی زانوئے ادب تھہ کرنا پڑتا تھا۔ جگر صاحب اور عزیز الحسن مجذوب کے سامنے یہ جان بے ساختگی ایسا خاموش ہو جاتا تھا کہ جیسے منه میں زبان، ہی نہ رکھتا ہو۔ جگر صاحب کے بارے میں تو فنا صاحب بہت کچھ کہہ سن گئے مگر مجھے معلوم ہے کہ عزیز الحسن مجذوب کا کتنا گہرا اثر فنا صاحب نے قبول کیا تھا۔ یہ سلسلہ حسن پرستی سے شروع ہو کر ادب، شاعری، فن اور حسن پرستی پر ختم ہو گیا۔ مجذوب نے فنا صاحب کو اپنے دائرے میں گھیٹ لیا تھا۔ جگر صاحب کے بعد مشاعروں میں اگر کسی کی تاجداری تھی تو فنا صاحب تھے۔ مرحوم کو مرغوبیت کے

ہر جلوے سے ازیلی بیر تھا۔ تقدیم و تاخیر ان کے یہاں کوئی معنی نہیں رکھتے تھے مگر ہر صاحب دستار و کلاہ سے انہوں نے اسی مسئلے پر پنجہ کشی بھی کر دی جو بزم خود اپنی اولیت کے ڈھنڈوڑے پیٹتے تھے ان سب کو نیچا دکھانے میں فنا صاحب نے کوئی کورس رباتی نہ رکھی۔ شہر کے امیروں اور رئیسوں کی محفلوں میں وہ خوشنامد کے باوجود بھی نہ جاتے تھے لیکن احباب اور مخلصین کی محفلوں میں جانے سے انہیں کوئی گریز نہ تھا اور محفل کو یادگار بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھانے رکھتے تھے۔ دوستی اور دوستوں کیلئے خود پر دگی کا جذبہ میں نے پھر کسی میں نہ دیکھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں دھوم مچانے والا یہ شاعر جب اپنے حلقے کی طرف واپس آتا تو فتح و کامرانی کے قصے کبھی نہ چھیڑتا بلکہ شکوہ کرتا تو اس بات کا کہ تم لوگوں سے دور رہ کر اتنے دن بڑی اذیت میں گزارے ہیں۔ تو اضع اور انکسار میں ان کا کوئی صہیم و شریک نہ تھا۔ ان کی گفتگو کی سفا کی اور بے رحمی دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص کسی فلاکت زده یا وہ کو دیکھ کر روتے رو تے نہ حال بھی ہو سکتا ہے۔ گفتگو میں صفائی ایسی تھی کہ صاف گوئی بغلیں جھانکنے لگتی تھی۔ ان کی حقیقت بیانی سے کون زخمی ہوتا ہے یا کون جاں بر ہوتا ہے انہیں اس کی مطلق پرواہیں تھی۔

بے ایں ہمہ وہ عجیب انسان تھے، اپنے چھوٹوں کے کمالات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ان کا محبوب مشغله تھا، ایسا انسان اگر آج نظر آئے تو مجھے بھی اس کا پتہ دیجئے گا۔

فنا صاحب نوشیق یا تازہ واردانِ باطِ شعر و ادب کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز رکھتے تھے۔ راقم الحروف اور زیبر شفائی کی شعر گوئی کا تذکرہ وہ شہر کی ہر ادبی محفل میں کرنے سے نہیں چوکتے تھے چاہے اس محفل کے لوگ ان شخصیتوں سے کتنی ہی دوری اور پرخاش رکھتے ہوں۔ یہاں فنا صاحب درویش خدامست بن جاتے تھے اور زبان کا قرض ادا کر کے مطمئن بھی نظر آتے تھے ان کے یہاں تعلقات میں برابری کو بڑا دخل تھا۔

گھر پر پہونچنے والوں کی ساری ذمہ داری اور تو اضع وہ اپنے ذمہ رکھتے تھے۔ چائے اور پان ان کی زندگی میں کمزوری بن کر داخل ہو گئے تھے۔ پان خود اپنے ہاتھ

سے لگاتے تھے۔ پان کی نہیں نکال دیتے تھے۔ چائے پینا اور پلانا ان کی ترجیحات میں شامل تھا۔ گرین لیبل ان کی فہرست کی کمترین چائے تھی۔ اس کے نیچے اترنا ان کے بس میں نہ تھا۔ اکثر کہتے تھے کہ یہ دونوں شوق بھی جگر صاحب سے ملے ہیں۔

بے ریاضی کے جلوے فنا صاحب کے ساتھ دم توڑ چکے ہیں۔ وہ زیب محفوظ بھی تھے اور زیب داستان بھی۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگدے۔

مندرجہ بالاسطور تو یکجاںی کے جھروکے میں جھانکنے کی پہلی سیر ہی تھیں۔ ان کی شاعری، ان کے فن اور ان کی باغ و بہار شخصیت کیلئے تومقاۓ مستقل کتابیں درکار ہیں۔ انہوں نے زندگی صحت شعری اور زبان و بیان کی صفائی کیلئے وقف کر دی تھی لیکن ان کی شخصیت کی خیرہ سامانیوں سے گزرے بغیر کون پاسکتا تھا فنا نظامی کو۔ خدا جگر اکاذیمی اور اس کے متعلقین کو سلامت رکھے کہ وہ اس طرح کے کام کرتی رہتی ہے۔ اگر زندہ رہا اور اس طرح کا کوئی بہانہ یا موقع نصیب ہوا تو فنا صاحب کی شاعرانہ روش اور نجی پر روشی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

اس غیرت مند، خوددار، انسانیت نواز، صاف گوشاعر کو میں سلام کرتا ہوں جس نے دیارِ غیر یعنی پاکستان میں چودھری خلیق ازماں کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ شعر پڑھا تھا۔

غیرتِ اہلِ چمن کو کیا ہوا      چھوڑ آئے آشیاں جلتا ہوا  
یہ صرف جرأت و بے با کی کامظاہر نہیں تھا بلکہ اپنے عہد کی سیاسی بیداری کا اشارہ یہ اور دوسروں کی روش کی تنقید بھی اس میں شامل ہے۔

اپنی گفتگو کو اقبال کے اس شعر سے ہی مختصر کرتا ہوں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے  
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا



# فنا نظمی کا نپوری

## کچھ یادیں

ڈی۔ این۔ آریہ

جوہر لال نہرو روڈ، الہ آباد

ایک مہذب، باشدور اور منفرد شخصیت۔ ایک مخلص ہمتر اور بے مثال دوست۔ ایک محکم اور معتمد قوم پرست۔ عوام و خواص کا ہر دلعزیز۔ ان صفات کی مجموعی طور پر مترنم و متوازن شکل تھے عالمی شہرت یافتہ شاعر فنا نظمی کا نپوری! موصوف کی رحلت کے بعد مشاعروں کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا اُس کا پُر ہونا ناممکن ہے۔ میں اس مشاعرائی دنیا سے ایک عرصہ سے وابستہ ہوں۔ اُس کے نشیب و فراز، آداب و ضوابط اور تہذیبی مراتب سے بخوبی آشنا ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب ”پور“ سے تعلق رکھنے والے چار ہندوپاک گیر شعرا، جن کا شمار ایک ہی صفت میں ہوتا ہے اور جادو اثر تنم سے سامعین پر وہ والہانہ کیفیت طاری ہوتی تھی جس کی مثال پیرے کی بین کی کیفیت سے ہی دی جا سکتی ہے۔ اُن کے اسمائے گرامی ہیں شمیم جے پوری، انور مرزا پوری، خاموش عازی پوری اور فنا نظمی کا نپوری۔ اگرچہ یہ بھی حضرات دنیائے فانی سے کوچ فرم اچکے ہیں لیکن سونے سونے مشاعرے آج بھی اُن کا سوگ منار ہے ہیں۔ اُن شعرا کے عہد میں اور اُن کے بعد بھی اُن سے کہیں بڑے مرتبہ والے شعرا ہوئے اور آج بھی موجود ہیں مگر اُس مخصوص مقام کے حامل تنمریز شخصیت کے مالک شعرا اب نہیں ہیں اور اگر ہیں تو میری نظر سے او جھل ہیں۔ یہاں حضرت جگر مراد آبادی کو میں نے اس ذکر و بیان سے الگ رکھا ہے کہ میں اُن کو جس کلاس کا شاعر مانتا ہوں اُس کلاس کے وہ تنہا شاعر تھے۔ فنا صاحب کے انتقال کو بارہ برس ہو چکے ہیں لیکن اُن کی یادیں آج بھی اُن

کے مذاہوں کے ذہن و دل میں منور ہیں۔ راقم اُن کے مذاہوں کی فہرست میں خود کا بھی دعویٰ کرتا ہے۔ میں فنا صاحب کی بے پناہ عزت کرتا تھا اور وقت ملاقات ان کو سروقد تعظیم دیتا تھا۔ اُس عظیم انسان اور رنگارنگ فنکار کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنے میں مجھے انتہائی فخر و مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔

ایسا ناممکن ہے کہ فنا صاحب کا ذکر ہوا اور اُن کا یہ شعر فوراً ذہن میں تازہ نہ ہو

جائے:

ترکِ تعلقات کو اک لمحہ چاہئے  
لیکن تمام عمر مجھے سو چنان پڑا

ترکِ تعلقات کی نسبت سے یہ ایک اچھوتا اور زندہ جاوید شعر ہے۔ دراصل فنا صاحب اور یہ شعر ایک دوسرے کی پہچان بن چکے ہیں۔ اثر (Effect) کے لحاظ سے یہ شعر مرقص بھی ہے شعر مطرب بھی اور شعر مقبول بھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُن کے دیگر اشعار بھی ایک نہ ایک قسم کے دعوے دار ہیں۔

فنا صاحب جب رسوماتی حدود کو ترک کرتے ہوئے روح صداقت کی جانب مائل ہوتے ہیں تو اس تصوف انگلیز شعر کی تخلیق ہوتی ہے:

ہر در کو ترے در کی قسم چھوڑ دیا ہے  
صحنِ حرم و روئے صنم چھوڑ دیا ہے

”ترے در کی قسم“، کہہ کر فنا صاحب نے اس شعر میں عجیب معنویت پیدا کر دی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنا اس شعری روزمرہ کے حسن کے اس شعر میں فصاحت کے ساتھ اُسی مرتبہ کی بلاغت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ الفاظ اور مناسبت پر فنا صاحب کی اچھی گرفت ہے۔ وہ الفاظ کے دھنی تھے اور اُن کے مناسب استعمال کے ماہر۔ اُن کا ماننا تھا کہ جب تک صحیح اور موزوں الفاظ کا استعمال نہیں ہو گا شعر کا اصل مفہوم اُجاگر نہیں ہو سکتا ہے۔ ایک او سط درجے کے طالب علم کے لئے لفظ ”حرث“ اور لفظ ”ارمان“

کے معنی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن معنویت کے لحاظ سے ان دونوں الفاظ میں  
کتنا فاصلہ ہے یہ فنا صاحب کے اس یادگار شعر میں ملاحظہ کیجئے:

اے جلوہ جانا ناں! اک ایسی جھلک دکھلا

ارماں بھی رہے باقی حسرت بھی نکل جائے

تمنا پوری ہو جانے کے بعد بھی نہ ملنے کا افسوس باقی رہ سکتا ہے، اس نفیاً تی  
زاویہ کو فنا صاحب نے اس شعر کے حوالے سے روشن کیا ہے۔ لفظ ”جلوہ جانا ناں“ اور  
”جھلک“ اس شعر میں ویسے ہی خوبصورت معلوم ہو رہے ہیں جیسے کسی پُر آب جھیل میں  
کنول کے پھول جنہیں دیکھ کر جمالیاتی تسلیم ہوتی ہے۔

فنا صاحب کے شعری خزانہ میں جوا شعار لعل و گوہر کی مانند درخشاں ہیں اور  
جو سخن فہم کی پسند ہیں چند مندرجہ ذیل نمونے ملاحظہ ہوں:

اک تیرے دیکھنے کیلئے بزم میں مجھے

اور وہ کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا

گھر ہوا، گلشن ہوا، صحراء ہوا

ہر جگہ میرا جنوں رُسوا ہوا

جب میرے راستے میں کوئی میکدہ پڑا

اک بارا پنے غم کی طرف دیکھنا پڑا

مجھ کو تو محبت ہے ہر اہل گلستان سے

گلچیں کا جو دشمن ہو گلشن سے نکل جائے

فنا صاحب کا ایک شعر جسے انہوں نے پاکستان کے ایک مخصوص مشاعرہ میں

چودھری خلیق الزمائ کی موجودگی میں پڑھا تھا۔ اس نے نہ صرف اہل ذوق اور اہل دل سامعین کو متاثر کیا بلکہ ایک عرصہ تک ہندوپاک میں موضوع سخن بنارہا۔ شعر ملاحظہ فرمائیے جوان کی تہذیبی اور تاریخی بصیرت کا ترجمان ہے۔

غیرتِ اہلِ چمن کو کیا ہوا

چھوڑ آئے آشیاں جلتا ہوا

نا ہے پاکستان میں اس شعر کا جواب دینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن جلتا ہوا آشیاں چھوڑ کر چلے جانا ایک ایسی غمناک حقیقت ہے جس کی طرف دلیل ہی دی جاسکتی ہے صفائی نہیں۔

شعر ناتے وقت فنا صاحب اپنے اشعار کی مجسم تصویر بن جاتے تھے جس سے سامعین کے دل و جد و رقص کی کیفیت سے سرشار ہو کر جھوم اٹھتے تھے۔ ایک بار فنا صاحب حیدر آباد کے ایک مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ یہ بات شاید ۱۹۷۸ء کی ہے۔ اس مشاعرہ میں فراق گور کھپوری بھی شریک تھے۔ فنا صاحب کو دعوتِ سخن دی گئی، انہوں نے اپنے مخصوص اور پُر کیف انداز سے مشاعرہ لوٹ لیا۔ مشاعرہ گاہ داد و تحسین سے گونج اٹھا جس کا جادوی اثر دیر تک ماحول پر طاری رہا۔ اب حضرت فراق کو دعوتِ کلام دی گئی اور مائیک آن کے سامنے رکھ دیا گیا۔ فراق صاحب داد کے محتاج نہیں تھے اور ”بیدادیت“ آن سے پناہ مانگتی تھی۔ فراق صاحب اپنی غزل ترنم سے پڑھنے لگے۔ سامعین نے بھر پور مزہ لیا۔ مشاعرہ کے اختتام پر فنا صاحب نے فراق کو چکلی لیتے ہوئے فرمایا کہ فراق صاحب آپ ترنم سے شعر نہ پڑھا کریں۔ فراق کب چونکنے والے تھے، انہوں نے کہا، فنا صاحب آپ کا ترنم ”ترنم محض“ ہے اور میرا ترنم ”ترنم معنی“۔ اے بھائی میں تو مشاعرے کے مترجم ماحول میں اس قدر گم تھا کہ مجھے یہ خیال بھی نہ رہا کہ آپ یہاں موجود ہیں، ورنہ میں ترنم سے نہ پڑھتا۔

فنا صاحب مشاعرہ میں شرکت کیلئے اپنے اصول اور خودداری کیلئے مشہور

تھے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ایک بار، ہم دونوں کے اصول میں تکراؤ کی صورت پیدا ہو گئی۔ قصہ اکتوبر ۱۹۸۰ء کا ہے۔ مرزاپور میں جشن انور مرزاپوری کا انعقاد ہوا۔ میں مشاعرہ کمیٹی کا صدر تھا۔ میں نے انور صاحب سے ان کے پسند کے شاعر کا نام دریافت کیا جسے مشاعرے میں مدعو کیا جائے۔ انہوں نے اپنے دوست فنا نظامی کا نپوری کا نام پیش کیا، جن کا نام پہلے سے ہی مدعو شعراء کی فہرست میں تھا۔ میں نے فنا صاحب کو فوراً دعوت نامہ روانہ کر دیا۔ میں اپنی عادت اور اصول کے مطابق کسی شاعر کو خط میں زادرہ یا اعزاز یہ کی رقم کا ذکر نہیں کرتا ہوں۔ مشاعرہ میں ان کی شرکت کی گزارش کرتے ہوئے یہ ضرور عرض کرتا ہوں کہ آپ کے شایانِ شان آپ کی تواضع کی جائے گی۔ تمام شعراء کو یہ بات معلوم ہے کہ زادرہ میں میری طرف سے کوئی کمی نہیں رہتی اور یہ بات فنا صاحب کو بھی معلوم ہے۔ دعوت نامہ میں اعزاز یہ کی رقم کا کوئی ذکر نہ دیکھ کر فنا صاحب نے مجھ کو لکھا کہ ان کو نذرانہ کی کسی خاص رقم سے دلچسپی نہیں ہے لیکن اصول کے مطابق وہ پیش کی جانے والی رقم کی جانکاری مشاعرہ میں شرکت سے پیشتر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اس صاف گوئی کے بعد بھی میں نے انہیں نذرانہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف وہی بات دہرا دی کہ آپ کے شایانِ شان آپ کی ہر طور سے خدمت کی جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فنا صاحب شریک مشاعرہ نہیں ہوئے۔ انور مرزاپوری کو اس خط و کتابت کا کوئی علم نہیں تھا اور نہ فنا صاحب کی عدم موجودگی کے سلسلہ میں میری ان کی کوئی گفتگو ہوئی لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ فنا صاحب کے نہ آنے سے انور صاحب کو کافی صدمہ پہنچا۔ اس سانحہ کو بیس سال ہو گئے مگر میں فنا صاحب کے قیمتی اصول سے تکرانے کیلئے آج بھی اپنے کو مجرم سمجھتے ہوئے ندامت اور افسوس کی آگ میں جلس رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا منصفانہ اعتراف ہے کہ فنا صاحب بجا تھے اور میں بے جا۔



# عکسِ تحریر حضرت فنا ناظمی کا نپوری

## خط بنام عارف محمود صاحب

۴۸۷

عزیزم عارف اسلام ہمنون

کمل جو کو کر خریدا چہ وہ اسقدر دشواری ملے بند ہے اے  
کوچھ ایسے ہوت مزد روکشی مرنما پر قی ہے جب کامبا ب ہونا ہے  
بعد آپ کی چھی سے سیکھن کر مزد ہو گا۔ لہذا آپ ابھی انھیں  
ترسم نہ دیں اگر دوسرا کو کر جو بہ اسانی بند ہونا ہو تو سن  
خرید مکور گا اور نہ دا پس کر درج گا۔ جب ٹھہردا کو کر زندگی  
دشواری سے بند ہے اے تو گرم کا کیا حال ہو گا  
میں حاضر ہوا تھا مگر آپ سے ملکات نہ ہو سکی۔ ابھی وہ  
کو کر بالکل استعمال نہ ہوا ہے۔ دوسرا کو کر مل گا  
جو اسانی سے بند ہے اے تو سن خروز خرید مل گا۔  
رسنے اللہ تعالیٰ عرض کر دیہ یہ بات ان جو ترے کو شگذار  
کر دیں۔ احمد کہ آپ لعائیت برہے گے

اعلام ایضا  
فنا ناظم

۱۲/۲/۲۰۰۷

# فنا نظامی :: ایک فن کار ایک شخصیت

..... از۔ شہناز بیگم

کسی ایسے فن کار کے بارے میں کچھ کہنے سے پیشتر بڑی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر شہرت بھی رکھتا ہو اور ہر دلعزیز بھی ہو۔ اس صورت میں شخصیت کے کئی پہلو ابھر کر واضح طور پر سامنے آتے ہیں اور یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ کسے بنیاد مان کر دیگر اوصاف کا حتی المقدور احاطہ کیا جائے جبکہ ”ہر گلے رارنگ و بوئے دیگر است“ کے مصدق موصوف کی شخصیت کا ہر پہلو اہم اور مکمل معلوم ہوتا ہو۔ ایسی حالت میں لفظ و بیان کے سارے اصراف کے بعد ایک غیر اطمینانی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ کیا ہم اس فن کار کے متعلق لفظ و بیان کی وساطت سے اس کے فن اور شخصیت کی کلیٹا توضیح کر بھی پائے؟ اور اگرچہ پوچھئے تو بھی تذبذب جے تشنگی کہہ لیجئے اس فن کار کی عظمت شخصیت فن کی دلیل بھی ہے۔

فنا نظامی کا نپوری کے انتقال کو کم و بیش بارہ برس ہو چکے ہیں لیکن ان کی موت کو دل اب بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتا اور اس قلیل یا طویل مدت میں ان کی غیر موجودگی کا احساس نہ صرف طبقہ شعرا، وادباء میں بلکہ غیر ادبی لوگوں میں بھی مسلسل نظر آرہا ہے جو ان کی ہمہ گیری و ہر دلعزیزی کی شناخت ہے۔ فنا مرhom کے بارے میں کم از کم میں اس تعیین میں قاصر ہوں کہ ان کافی، ان کی شخصیت کی تہذیب و تعمیر میں کلیدی و بنیادی حیثیت رکھتا ہے یا شخصیت کا ان کے فن پر حاوی رجحان ہے۔ اس سلسلے میں جن لوگوں سے بات چیت ہوئی انہیں مختلف الہیال پایا اور میں نے محسوس کیا کہ شاید یہ اختلاف بھی فنا نظامی کے عظیم المرتبت ہونے کی دلیل ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ میں نے فنا نظامی کو کئی پہلوؤں سے بر بنائے مشاہدات و تجربات پر کھایا جانچا ہے تو شاید اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس ضمن میں سب

سے پہلے میں عرض کرنا چاہوں گی کہ فنا ناظمی کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں تھے وہ بھی ہم جیسے ہی تھے۔ خوبیوں اور خامیوں سے متصف لیکن وہ انسان تھے۔ اس میں شاید ہی کوئی دوراً میں رکھتا ہوں کہ انسانیت کی تعریف میں جس قدر بھی خوبیاں ہیں غالباً ان میں سے چند ہی کافنا مرحوم کی شخصیت میں فقدان ملے اور یہ ایک بڑی خوبی کی بات ہے۔ رہیں خامیاں یا ناگواریاں، تو یہ بھی ان کی کتاب زندگی میں خال خال نظر آ جاتی ہیں لیکن یہ ناپسندیدگیاں بیزاریوں کے باب میں کم اور زیب داستان حیات کے ضمن میں زیادہ محسوس ہوتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کے چند ناپسندیدہ رویے بھی لوگوں کو کچھ ایسے ناگوار نہیں گزرے بلکہ ان حضرات نے جوان سلوکوں کے شکار ہوئے انہیں فنا ناظمی سے بر بنائے تعلق خاص کی تحویل میں شامل کر لیا۔ آج تک مجھے فنا مرحوم کے سلوک ناروا کا کوئی شاکن نہیں ملا۔ یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک مستحکم گوشہ ہے جوان سے شناسائی سے آج تک مسلسل میرے مشاہدات میں آتارہا، اس میں ان کے ہم عمر، ان سے چھوٹے اور بزرگ بھی شامل ہیں۔

فنا ناظمی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ہر مخالف و نشست میں اور ہر عمر و مرتبہ کے حاضرین میں ہمیشہ منفرد و نمایاں نظر آئے، کسی مسئلے یا معاملے میں جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کسی نے بھی ان کی رائے یا فیصلے کی مخالفت شاید ہی کی ہو، خواہ وہ ادبی ہو یا غیر ادبی۔ یہ ان کے متوازی الرائے ہونے کی دلیل بھی ہے، ان کا نقطہ نگاہ جیسا میں نے محسوس کیا ہے اس لحاظ کے ساتھ ہمیشہ رہا کہ ہر مکتبہ فکر و خیال کے لوگوں کیلئے قابل قبول ہو۔ یہی سبب غالباً ان کے شاعرانہ وقار کے ساتھ ساتھ موصوف کی ہمہ گیری و مقبولیت کا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ نظریات کے پختہ کار لوگ بھی ان کے ٹھوس دلائل و معقولیت کے آگے سپر انداز ہو کر ان کے زمرة فکر و خیال میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔

فنا ناظمی کی اوائل عمری کا زمانہ جن کرب، بے چینیوں اور آزمائشوں سے مملو ہے ان کی جزئیات کو اگر مرتب کیا جائے تو ایک متاثر کن طویل فہرست تیار ہو جائے گی۔

طفولیت کا دور جسے عموماً بے فکر یوں کے زمانے سے تعبیر کیا جاتا ہے کچھ ایسا رہا کہ مرزا شار علی بیگ فنا نظامی اپنے مجذوب والد مرزا مسعود علی بیگ اور والدہ محترمہ کے بقید حیات رہتے ہوئے بھی نہ صرف ان کی شفقتوں اور سر پستیوں سے محروم رہے بلکہ ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود فاصلے اتنے بڑھ گئے کہ فنا نظامی برسوں ان کی ملاقاتوں کو بھی ترس گئے حالانکہ وہ اپنی اس طفیلی عمر کے سفر میں تنہانہ تھے، ان کی ایک بڑی بہن اور بڑے بھائی مرزا محفوظ علی بیگ مرحوم ان کے ہمراہ تھے جن کے ما بین عمری تفاوت بہت کم تھا اور جو فنا صاحب کی طرح ان حالات کے شکار تھے، اس لئے بجائے اس کے کہ اذیتیں باہم دگر تقسیم ہو کر ہلکی ہو جاتیں فنا صاحب کی حساس طبیعت اپنے علاوہ متعلقین کی تکلیفوں کا فکری بار بھی اٹھائے رہی، جس سے ان کے بھی المیہ سرمائے میں اضافہ ہی ہوا۔ بہر حال فنا صاحب کو پل صراط سے تو گزرنا ہی تھا اور جیسے تیسے گزر بھی گئے لیکن اس کے بعد انہیں اپنی جنت خود تعمیر بھی کرنی تھی۔ یہ احساس انہیں ابتداء ہی سے تھا لہذا ارادہ مصمم شرمندہ تعبیر بھی ہوا۔

اس دور آزمائش سے گزر جانے کے بعد فنا صاحب نے اپنی زندگی کو جتنا باغ و بہار بنایا وہ زندگی کے اس اولین کر بنا ک دور پر ایک فاتحانہ قہقهہ تھا یا پھروہ ان کڑواہوں میں شکراندازی تھی جوان کے شعور کی بیداری سے تقدیر نے ان میں بھردی تھیں جن کا اب وجود تونہ رہ گیا تھا لیکن ان کی یادیں اس دور آسوگی و فراغت میں ہنوز بے پناہ تلخ تھیں جن لوگوں نے فنا صاحب کو قریب و دور سے دیکھا ہے وہ ان کی مرجانیاں مرنخ طبیعت اور بذله سخ فطرت کو شاید ہی بھی بھلا پائیں۔

فنا صاحب نے انتہائی قلیل عرصے میں دنیاۓ شعر و ادب میں جو ایک معتبر و مقندر مقام حاصل کر لیا اسے ایک معجزہ ہی کہہ لیجئے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی کی کر بنا کیوں اور محرومیوں کے دور امتحان میں ان کا مرانیوں کا منجانب قدرت انہیں انعام تھا۔ انہوں نے اپنے مذکورہ ابتدائی زمانے کو جس صبر و استقامت لیکن تسلی جدوجہد عمل کے ساتھ گزارا اس کا درس انہوں نے عوام کو بھی دیا:

زندگی نام ہے اک جہد مسلسل کافا را ہر دوسری بھی تھک جاتا ہے آرام کے بعد امتحان طلبِ خام لیا ساقی نے جامِ لبریز دیا ذریعہ جام کے بعد اسی غزل کے مطلع میں بھی ان کی گذشتہ زندگی کی جانب ایک طنز آمیز اشارہ ملتا ہے:

چہرہ صبح نظر آیا رُخِ شام کے بعد  
سب کو پہچان لیا گردشِ ایام کے بعد  
کسی فنکار کے معیار کے تعین میں لوگوں کا مختلف الہیخال ہونا فطری ہے،  
اربابِ شعروادب فنا صاحبِ کوشاعری کے جس معیاری خانے میں بھی رہیں، اس حقیقت سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کلائیکی ہوتے ہوئے بھی سپاٹ اور بندھے ملکے ادبی اصولوں کی پابند نہیں رہی، ان کے شعروں میں ترتیب و نشت الفاظ اور علام تو ضرور قدیم ہیں لیکن فکریاتِ جدید ہیں۔ وہ جدیدیت پسند تھے لیکن ادبی بے راہ روی اور تحرییدیت کے تاحیات مخالف رہے۔ انہوں نے کچھ شعر ایسے بھی کہے جن میں نہ صرف فکری عنصرِ جدید ہے بلکہ الفاظ بھی نئے لیکن مروجہ ہیں:

میرے گھر کے دیوار و در ہر دم پتے رہتے ہیں  
کتنی دھوپِ سمیٹ کے رکھ لی چھوٹی سی انگنانی نے  
فنا صاحبِ مزا جا مستغنى تھے اور ان کا یہ استغنا ان کے شعروں میں بھی پایا جاتا ہے:

بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن  
ڈوبنے کو تو ڈوبے مگر ناز ہے ابلِ ساحل کو ہم نے پکارا نہیں  
میری غیرت نے وہ راہ بھی چھوڑ دی جس میں دھندا لاسا بھی نقشِ پامل گیا  
دنیاے تصور ہم آباد نہیں کرتے یاد آتے ہو تم خود رہی، ہم یاد نہیں کرتے  
وہ زمانے کی فطرت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ شناسائی ان کی گذشتہ زندگی  
کے تلخ تجربات کی دین تھی چنانچہ آسودگی فراخی کے زمانے میں جوانہیں خود شناسی اور

جدوجہد کی بدولت نصیر ہوئے وہ کہہ اٹھے:

مجھے رتبہ غم بتانا پڑے گا اگر میرے پیچھے زمانہ پڑے گا  
رودا فصلِ گل نہ سنا تو جواب دے اے باغبان بتا مرے حصے میں کیا پڑا  
آج کچھ کہنا ہے دنیا سے مجھے آج تک دنیا کی میں سنتا رہا  
اسی غزل کے ایک شعر میں محاذات کی نازک ترین مثال ملتی ہے:  
اٹھ گیا وحشی لگا کر قہقہہ دیر تک محفل میں سنا تارہا

فنا صاحب کے بیشتر اشعار زبان زد عوام ہیں جن میں سے اکثر ضرب المثل  
ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان میں خیال و انداز کا تنوع بھی ہے جو متاثر کن ہے:  
وہ رند ہوں میں جس کے لئے شیخ حرم نے راتوں کو کھلا بابِ حرم چھوڑ دیا ہے  
حسن کا چہرہ بھی ہے اُترا ہوا ہمیشہ عیش و عشرت میں زمانہ ساتھ دیتا ہے  
بجھی جب شمع تو زندیک پروا نہیں آتے ترکِ تعلقات کو اک لمحہ چاہئے  
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا کر لیجھے توبہ کا یقین حضرتِ ناصح  
میخانے کو ساقی کی قسم چھوڑ دیا ہے ساحل کے تماشائی ہر ڈوبنے والے پر  
افسوس تو کرتے ہیں امداد نہیں کرتے اہلِ دیر و حرم رہ گئے تیرے دیوانے کم رہ گئے  
وہشتِ دل نے کیا خوب ہی رسوا مجھ کو اب تو دیوانہ بھی کہتی ہے یہ دنیا مجھ کو  
فنا صاحب کی مجموعی شاعری میں خاصی تعداد ایسے اشعار کی بھی ہے جن میں  
نسیاتی سچائیاں انتہائی نازک انداز میں پیش کی گئی ہیں جو دل کو چھوٹی ہیں:

اک تیرے دیکھنے کیلئے بزم میں مجھے  
اوروں کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا

ترکِ وطن کے بعد ہی قدرِ وطن ہوئی  
برسون مری نگاہ میں دیوار و در پھرے

منہ پھیر لیا اپنا خود ہم نے دم رخصت  
اندازِ سلام ان کا دیکھانہ گیا ہم سے

یہ ضرور ہے کہ فنا مر حوم نے جو کچھ بھی کہا اور جتنا کہا وہ اس خیال کے تحت کہا  
کہ انہیں عوامی مشاعروں میں پڑھنا ہے جو ان کی ناگزیر مجبوری تھی لیکن انہیں اس کا بھی  
پاس تھا کہ اکثر خواص کی نشتوں میں بھی شرکت کرنی پڑتی ہے اور اس لحاظ سے انہوں  
نے اپنی شاعری کو غیر معیاری ہونے سے بچایا۔ یہ ان کی فنکارانہ خوبی ہے جس نے  
انہیں دونوں ہی طبقوں میں مقبول کر دیا۔ یہ احساس غالباً نہ فاروقی کو بھی ہوا  
جنہوں نے فنا صاحب کے ساتھ ارتھاں کی خبر کو ”شبِ خون“ میں اس تبصرے کے ساتھ  
شائع کیا کہ فنا صرف مشاعروں ہی کے شاعر انہیں تھے بلکہ ان کی ادبی اہمیت بھی ہے۔  
زندگی کے آخری ایام تک باوجود مہلک علالت و نقابت کے فنا شعر کہتے  
رہے۔ جن میں سے چند یاد آرہے ہیں:

ہو گئی جب ختمِ حمدِ انتظار اپنی آنکھیں کھول کر میں سو گیا  
نقشِ پائے اہلِ ساحلِ مٹ گئے ایک طوفان کتنے دھبے دھو گیا  
دل کو بہلاتا تھا امیدوں سے میں اب مرا اک اک کھلونا کھو گیا  
اور بالآخر جولائی ۱۹۸۸ء صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے یہ ادبی گہر کم و  
بیش نصف صدی تک اپنی چمکِ دمک سے دنیا کے فن و شعر کو چمکا کر اجل کی تاریک  
آغوش میں ہمیشہ کسلیے مغم ہو گیا۔ ☆☆



یوم ما جس لکھنؤی کے موقع پر کلام پڑھتے ہوئے



جگرا کادمی کے مشاعرہ میں استحچ پر بیٹھے ہوئے



جگرا کادمی کے مشاعرہ میں کلام پڑھتے ہوئے۔



جشن افسر ناروی کے موقع پر



وی۔ ایس۔ رستوگی کے بنگلہ پر شعری نشست کے موقع پر



دفتر جگر اکادمی میں  
علامہ شارق ایرایانی اور جناب سلطان احمد خاں صاحب کے ہمراہ۔



جگر اکادمی کے مشاعرے میں طاہریں کے مجموعہ کلام کی رسم اجراء کے موقع پر

# نعتِ پاک

## قطعات



نور ہی نور ہے چار جانب  
کون سوتا ہے جالی کے اندر  
سینر گندید پہ شبہم کے قطرے  
چاند اوڑھے ہے تاروں کی چادر



حسنِ مستور نے بلایا ہے  
صاحب طور نے بلایا ہے  
روشنی کیوں نہ ہو دو عالم میں  
نور کو نور نے بلایا ہے



## نعت شریف



رازِ تخلیقِ کون و مکان آپ ہیں  
خود ہی اس راز کے راzdائ آپ ہیں

رہبر راہ ہر کارواں آپ ہیں  
کوئی منزل ہو منزل نشاں آپ ہیں

خاک اور نور کی داستان آپ ہیں  
پردہ و جلوہ کے درمیاں آپ ہیں

چشمِ ظاہر پہ کیا رازِ باطن کھلے  
کچھ عیاں آپ ہیں کچھ نہاں آپ ہیں

خلد و فردوس سے مجھ کو کیا واسطہ  
میری جنت و ہیں ہے جہاں آپ ہیں

کہہ رہی ہیں یہ قرآن کی آئتیں  
نکتہ رس آپ ہیں نکتہ داں آپ ہیں

کائنات دو عالم ہے اک داستان  
حاصلِ شہرتِ داستان آپ ہیں

پھول بھی مطمئن خار بھی مطمئن  
کس قدر معتبر با غباں آپ ہیں

آپ اور ذکرِ سرورِ جنابِ فنا  
نعمتِ گوئی کے لا اُق کہاں آپ ہیں



# غزلیات



دنیا نے تصور ہم آباد نہیں کرتے  
یاد آتے ہو تم خود ہی ہم یاد نہیں کرتے

وہ جو ریسل سے باز آ تو گئے لیکن  
بیداد یہ کیا کم ہے بیداد نہیں کرتے

ساحل کے تماشائی ہر ڈوبنے والے پر  
افسوں تو کرتے ہیں امداد نہیں کرتے

کچھ درد کی شدت ہے کچھ پاسِ محبت ہے  
ہم آہ تو کرتے ہیں فریاد نہیں کرتے

صحر سے بہاروں کو لے آئے چمن والے  
اور اپنے گلستان کو آباد نہیں کرتے

ہم مصلحتاً اپنا افسانہ بھلا بیٹھے  
کچھ یاد نہیں آتا کچھ یاد نہیں کرتے

آزاد کیا خود کو زندگی سے اسیروں نے  
ذہنوں کو غلامی سے آزاد نہیں کرتے

شاید کہ یہی آنسو کام آئیں محبت میں  
ہم اپنی متاع غم بر باد نہیں کرتے



کوئی سمجھے گا کیا رازِ گلشن  
جب تک اُنچھے نہ کانٹوں سے دامن

قلب پروانہ کی اُفرے دھڑکن  
خود بخود ہو گئی شمع روشن

کیسے پائے کوئی تیرا مسکن  
راہ رو کے ہیں شیخ و برہمن

عظمت آشیانہ بڑھادی  
برق کو دوست تسمجھوں کے دشمن

یک بیک سامنے آ نہ جانا  
رُک نہ جائے کہیں دل کی دھڑکن



وہ ہیں شرمندہ اپنے کرم پر  
میں پشیماں ہوں پھیلا کے دامن

اتنی آرائشِ آشیانہ  
ٹوٹ جائے نہ شاخِ نشیمن

گل تو گل خار تک چن لئے ہیں  
پھر بھی خالی ہے چین کا دامن

کتنی بیباک ہیں آرزو میں  
عشق کا یاد آتا ہے بچپن

—  
ان گلوں سے تو کانٹے ہی اچھے  
جن سے ہوتی ہے تو بین گاشن

اے فنا حسن پرمٹ کے تو نے  
کر دیا عشق کا نام روشن





میرے چہرے سے غم آشکارا نہیں  
یہ نہ سمجھو کہ میں غم کا مارا نہیں

پشمِ ساقی پہ بھی حق ہمارا نہیں  
اب بجزِ ترکِ مئے کوئی چارا نہیں

بھرِ غم میں کسی کا سہارا نہیں  
یہ کوئی آسمان کا ستارا نہیں

ڈوبنے کو تو ڈوبے مگر ناز ہے  
اہلِ ساحل کو ہم نے پکارا نہیں

غنجپه و گل کو چونکا گئی ہے خزاں  
فصلِ گل نے چمن کو سنوارا نہیں

غیر کے ساتھ کس طرح دیکھوں تجھے  
اپنی قربت بھی مجھ کو گوارا نہیں

یوں دکھاتا ہے آنکھیں ہمیں با غبار  
جیسے گلشن پہ کچھ حق ہمارا نہیں

ذکرِ ساقی ہی کافی نہیں اے فنا  
بے پئے میکدے میں گزارا نہیں





حسن خراماں اللہ اکبر  
رک رک گئی ہے نبضِ گلِ تر

کانٹوں کا جذبہ پھولوں کے اندر  
ایسے چمن سے صمرا ہی بہتر

بیٹھے تو سب ہیں میخوار بن کر  
عرفانِ مستی کس کو میر

پی تو گئے سب بھر بھر کے ساغر  
کوئی نہ سمجھا ساقی کے تیور

یہ اپنے اپنے دل کا مقدر  
پتھر ہے شیشہ، شیشہ ہے پتھر

ان کی نظر میں میرا بھرم تھا  
پچھتا رہا ہوں افسانہ کہکر

اُن کا تغافل ان کی توجہ  
دل کیلئے ہیں دونوں ہی نشرت

اس فتنہ گر کی نیند اللہ اللہ  
سوئی قیامت محشر جگا کر

کیا شے فنا ہے جوشِ جنوں بھی  
دیکھے تو کوئی دیوانہ بن کر



دل عشق میں ہوتا ہے مائل بہ فغاں پہلے  
جب آگ سلگتی ہے اٹھتا ہے دھواں پہلے

اظہارِ تمنا سے حسن اور نکھر آیا  
تھی ان کی اداوں میں یہ بات کہاں پہلے

تنقید گلتاں کا حق ہے مرے ہونڈوں کو  
میں نے ہی قفس میں بھی کھولی تھی زباں پہلے

ہر ظرف کے میکش ہیں ہر کیف کی صہباء ہے  
اس واسطے پیتا ہے خود پیرِ مغاں پہلے

مل جاتی ہے طوفاں سے ٹھکراتا ہے ساحل جب  
آتی ہے کنارے تک ہر موچ روائی پہلے

ہم اپنے نشیمن کے انجام سے واقف ہیں  
یا برقِ تپاں آخر یا برقِ تپاں پہلے

ابرو پہ بل آتے ہی ہوتی ہے نظر برہم  
جب تیر نکلتا ہے چھپتی ہے کماں پہلے



یہ بہار کا زمانہ یہ حسین گلوں کے سائے  
مجھے ڈر ہے باغبان کو کہیں نیند آنہ جائے

تیرے وعدوں پر کہاں تک مراد فریب کھائے  
کوئی ایسا کر بہانہ مری آس ٹوٹ جائے

مرے گلشنِ محبت میں خزاں کہاں سے آئے  
کبھی اس نے گل کھلائے کبھی میں نے گل کھلائے

تری سازش توجہ یہ نہیں تو اور کیا ہے  
میں جہاں چلا سن بھل کر وہیں پاؤں ڈگھاۓ

مرے ضبطِ غم کی عظمت کا پتہ بھی چل گیا ہے  
مرا امتحان لے کر کوئی تجھ کو آزمائے

کوئی ہم سے پوچھے ان کے کرم و ستم کا عالم  
کبھی مسکرا کے روئے کبھی روکے مسکراۓ

میں چلا شراب خانے جہاں کوئی غم نہیں ہے  
جسے دیکھنی ہو جنت مرے ساتھ ساتھ آئے



برق کو جتنی شہرت ملی  
آشیاں کی بدولت ملی

ضبطِ غم کی یہ قیمت ملی  
بے دفائی کی تہمت ملی

ان کو گل کا مقدر ملا  
مجھ کو شبہنم کی قسمت ملی

قلبِ میخوار کو چھوڑ کر  
مجھ کو ہر دل میں نفرت ملی

عمر تو کم ملی شمع کو  
زندگی خوبصورت ملی

موت لائی نئی زندگی  
میں تو سمجھا تھا فرصت ملی

✓  
ہر گنہگار کو اے فنا  
گود پھیلائے رحمت ملی

\*



ہم آگئی عشق کا افسانہ کہیں گے  
کچھ عقل کے مارے ہمیں دیوانہ کہیں گے

رہتا ہے وہاں ذکرِ طہور و منے کوثر  
ہم آج سے کعبہ کو بھی میخانہ کہیں گے

— عنوان بدل دیں گے فقط آپ کی خاطر  
ہم جب بھی کہیں گے یہی افسانہ کہیں گے

پروانے کو ہم شمع سمجھتے ہیں سرِ شام  
ہنگام سحر شمع کو پروانہ کہیں گے

سر کھکھ کے ترے پاؤں پہ ہم کرتے ہیں شکوہ  
کچھ لوگ اسے سجدہ شکرانہ کہیں گے

بن جائے گا اللہ کا گھر خود ہی کسی دن  
فی الحال فنا دل کو صنم خانہ کہیں گے





یوں تری تلاش میں تیرے خستہ جاں چلے  
جیسے جھوم جھوم کر گرد کارواں چلے

آج یوں ہی ساقیا جام ارغوان چلے  
جیسے بزم وعظ میں شیخ کی زبان چلے

راہِ غم میں ہم سے وہ یوں کشاں کشاں چلے  
جیسے پچ کے عشق سے حسن بدگمان چلے

دل دھڑک دھڑک اٹھا یوں کسی کو دیکھ کر  
جس طرح بہار میں نبضِ گلتاں چلے

دل کی انجمان سے یوں جا رہا ہے ضبطِ غم  
جیسے راز کھولنے کوئی رازداں چلے

شیخ جا رہا ہے یوں سوئے میکدہ فنا  
سر جھکا کے جس طرح عمرِ رائگاں چلے



❀

چہرہ صبح نظر آیا رخِ شام کے بعد  
سب کو پہچان لیا گردشِ ایام کے بعد

مل گئی راہِ یقین منزلِ اوہام کے بعد  
جلوے ہی جلوے نظر آئے دروبام کے بعد

چاہئے اہلِ محبت کو کہ دیوانہ بنیں  
کوئی الزام نہ آئے گا اس الزام کے بعد

امتحانِ طلبِ خام لیا ساقی نے  
جامِ لبریز دیا دُرد تھہ جام کے بعد

ہائے کیا چیز ہے یہ لطفِ شکستہ پائی  
حوالے اور بڑھے کوششِ ناکام کے بعد

زندگی نام ہے اک جہد مسلسل کافنا  
راہرو اور بھی تھک جاتا ہے آرام کے بعد





## ”سرایا“

اک حسنِ رنگیں آیا لب جو  
کس طرح رکھے نظرؤں پہ قابو

شاداب عارض بیتاب گیسو  
ہیں کفر و ایماں پہلو بہ پہلو

نظرؤں کی گردش ابرو کی جنبش  
مستی کو تولے جیسے ترازو

روشن جبیں پر قطرے عرق کے  
سورج کا دامن تاروں کے آنسو

نازک لبوں پر مونِ تبسم  
خوابیدہ غنچہ، بیدار خوشبو

سوزِ ترجم، سازِ تکلم  
گیتوں کی ہندی، غزلوں کی اردو

انگرائیوں کا عالم نہ پوچھو  
جیسے فرشتہ کھولے ہو بازو

الہڑ جوانی، محشرِ خرامی!  
ظامِ شکاری چالاک آہو

حسنِ مکمل صہبا کی بارش  
شاعر کی دنیا پیاسے کا چلو





یارب مری حیات سے غم کا اثر نہ جائے  
جب تک کسی کی زلف پر بیشاں سنور نہ جائے

وہ آنکھ کیا جو عارض و رخ پر ٹھہر نہ جائے  
وہ جلوہ کیا جو دیدہ و دل میں اُتر نہ جائے

میرے جنوں کو زلف کے سائے سے دور کھو  
رستے میں چھاؤں پا کے مسافر ٹھہر نہ جائے

میں آج گلستان میں بلا لوں بہار کو  
لیکن یہ چاہتا ہوں خزاں روٹھ کرنہ جائے

پیدا ہوئے ہیں اب تو مسیحانے نئے  
بیمار اپنی موت سے پہلے ہی مر نہ جائے

کر لی ہے توبہ اس لئے واعظ کے سامنے  
الزامِ تشنگی مرے ساقی کے سر نہ جائے

ساقی پلا شراب مگر یہ رہے خیال  
آلامِ روزگار کا چہرہ اُتر نہ جائے

میں اُس کے سامنے سے گزرتا ہوں اس لئے  
ترکِ تعلقات کا احساس مر نہ جائے

مسرورِ دیدِ حسن ہے اس واسطے فنا  
دنیا کے عیب پر کبھی میری نظر نہ جائے





یہ گھٹائیں کالی کالی جو فضا پہ چھا رہی ہیں  
اسی تیرگی سے ساقی ترا میکدہ ہے روشن

تری ہر نظر نوازش مرا ہر نفس گذارش  
ترے پاس دونوں عالم مرے پاس صرف دامن

مری مہلتِ نظر تک تری پرده داریاں ہیں  
نہ چھپا سکے گی تجھ کو وہ نقاب ہو کہ چلمن

مرے دل میں داغ غم ہے مری آنکھ میں ہے آنسو  
کبھی یہ چراغ روشن کبھی وہ چراغ روشن

مجھے ناتواں سمجھ کرنہ زمانہ مجھ سے اُبھے  
مری زندگی ہے تیشہ مرا حوصلہ ہے آہن

مجھے راہزن کا ڈر کیا مرے ساتھ تیراغم ہے  
مرے پاس اور کیا ہے جسے لوٹ لے گارہزن

اسی شرم نے ہمیشہ مجھے بے نیاز رکھا  
کہاں ان کی شانِ بخشش کہاں میرا تنگ دامن

تجھے با غباں مبارک یہ چمن خزاں رسیدہ  
میں کسی کو کیا دکھاؤں یہ قفس نما نشیمن





یوں انتقام تجھ سے فصلِ بہار لیں گے  
پھولوں کے سامنے ہم کا نٹوں کے پیار لیں گے

جانے دو ہم کو تنہا طوفانِ آرزو میں  
جب ڈوبنے لگیں گے تم کو پکار لیں گے

جو کچھ تھا پاس اپنے دنیا نے لے لیا ہے  
اک جان رہ گئی ہے وہ غم گسار لیں گے

اس دورِ تشنگی میں کیا میکدے کو چھوڑیں  
کچھ دن گزر گئے ہیں کچھ دن گزار لیں گے

صیاد و باغمیاں کے تیور بتا رہے ہیں  
یہ لوگ فصلِ گل کے کپڑے اتار لیں گے

وہ خانماں خراب نہ کیوں در بدر پھرے  
جس سے تری نگاہ ملے یا نظر پھرے

راہِ جنوں میں یوں تو ہیں لاکھوں ہی سر پھرے  
یاربِ مری طرح نہ کوئی عمر بھر پھرے

رفتارِ یار کا اگر انداز بھول جائے  
گلشن میں خاک اڑاتی نسیم سحر پھرے

ساقی کو بھی سکھاتے ہیں آدابِ میکشی  
ملتے ہیں میکدے میں کچھ ایسے بھی سر پھرے

ترکِ وطن کے بعد ہی قدرِ وطن ہوئی  
برسون مری نگاہ میں دیوار و در پھرے





رہ جائے چند روز جو بیمارِ غم کے پاس  
خود اپنا دل دبائے ہوئے چارہ گر پھرے

میں اپنا رقصِ جام تجھے بھی دکھاؤں گا  
اے گردش زمانہ مرے دن اگر پھرے

میری نگاہ میں تو غزل ہے اُسی کا نام  
جس کی رگوں میں دوڑتا خونِ جگر پھرے

قیدِ غمِ حیات بھی کیا چیز ہے فنا  
راہِ فرار مل نہ سکی عمر بھر پھرے





آج اُس سے میں نے شکوہ کیا تھا شرارتا  
کس کو خبر تھی اتنا بُرا مان جائے گا

اس کفر عشق سے مجھے کیوں روکتے ہو تم  
ایمان والو میرا ہی ایمان جائے گا

سب لوگ ہوں گے اس سے تعارف کی فلکر میں  
مجھ کو مرے سکوت سے وہ جان جائے گا

دنیا پہ ایسا وقت بھی آئے گا ایک دن  
انسان کی تلاش میں انسان جائے گا

کشتی ناخدا کو تو غرقاب کر چکا  
اب ساحلوں کی سمت یہ طوفان جائیگا

یہ سوچتا ہوں رنگِ چمن دیکھ کر فنا  
کیا رائیگاں بہار کا احسان جائے گا





ڈوبنے والے کی میت پر لاکھوں رونے والے ہیں  
پھوٹ پھوٹ کر جو روتے ہیں وہی ڈبوئے والے ہیں

کس کس کو تم بھول گئے ہو غور سے دیکھو بادہ کشو  
شیش محل کے رہنے والے پھر ڈھونے والے ہیں

سونے کا یہ وقت نہیں ہے جاگ بھی جاؤ بے خبر و  
درنہ ہم تو تم سے زیادہ چین سے سونے والے ہیں

آج سنا کر اپنا فسانہ ہم یہ کریں گے اندازہ  
کتنے دوست ہیں ہنسنے والے کتنے رونے والے ہیں

میں بھی انہیں پہچان رہا ہوں غور سے دیکھو بادہ کشو  
شايدِ شیخِ حرم بیٹھے ہیں وہ جو کونے والے ہیں





وہ جانے کتنا سر بزم شرمدار ہوا  
سنا کے اپنی غزل میں قصور وار ہوا

ہزار بار وہ گزرا ہے بے نیازانہ  
نہ جانے کیوں مجھے اب کے ہی ناگوار ہوا

ہزاروں ہاتھ مری سمت ایک ساتھ اٹھے  
مگر میں ایک ہی پتھر میں سنگ سار ہوا

میں تیری یاد میں گم تھا کہ کھا گیا ٹھوکر  
یہ حادثہ مری را ہوں میں بار بار ہوا





غم ہر اک آنکھ کو چھلکائے ضروری تو نہیں  
اب رائٹھے اور برس جائے ضروری تو نہیں

برق صیاد کے گھر پر بھی تو گر سکتی ہے  
آشیانوں پہ ہی لہرائے ضروری تو نہیں

راہبر راہ مسافر کو دکھا دیتا ہے  
وہی منزل پہ پہونچ جائے ضروری تو نہیں

نوک ہر خار خطرناک تو ہوتی ہے مگر  
سب کے دامن سے الجھ جائے ضروری تو نہیں

غنجے مرجھاتے ہیں اور شاخ سے گر جاتے ہیں  
ہر کلی پھول ہی بن جائے ضروری تو نہیں





مجھے پیار سے ترادِ لکھنا مجھے چھپ چھپا کے وہ دلکھنا  
مرا سویا جذبہ ابھارنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

روہ و رسم قلب و زگاہ کے وہ تمہارے دعوے نباہ کے  
وہ ہمارا شیخنی بگھارنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ ہماری چھیڑ وہ شوختیاں وہ ہمارا کاشنا چٹکیاں  
وہ تمہارا کہنی کا مارنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی سردا آہوں کے سلسلے کبھی ٹھنڈی سانسوں کے مشغلوں  
وہ ہماری نقلیں اتارنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تمہارا شاعر خوش نوا جسے لوگ کہنے لگے فنا  
وہ نثار کہہ کے پکارنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو





خبر کو اداں دیکھتے ہیں  
بے خوف و هراس دیکھتے ہیں

جو لوگ لباس دیکھتے ہیں  
اپنا ہی قیاس دیکھتے ہیں

ڈوبی ہے کوئی شکستہ کشٹی  
موجوں کو اداں دیکھتے ہیں

ہیں سب کی نظر میں تیرے دشمن  
ہم ہوش و حواس دیکھتے ہیں

دن رات ہجوم ہوش ناداں  
دیوانے کے پاس دیکھتے ہیں

یاد آتا ہے اپنا اک زمانہ  
جس کو بھی اداں دیکھتے ہیں

ہر مغل دل میں اک جگہ پر  
امید و یاس دیکھتے ہیں

فن اس کو دکھاتے ہیں کہ جس کو  
فنا کار شناس دیکھتے ہیں

ہم زہر کو دیکھتے ہیں اور سب  
حسنِ الماس دیکھتے ہیں

ہر رند کے ہاتھ میں فنا اب  
خالی ہی گلاں دیکھتے ہیں





ساقی تری مکھل میں ہم جام اچھا لیں گے  
جب کعبہ میں جائیں گے زم زم سے نہایں گے

ہم دشت نور دی کا کچھ اور مزہ لیں گے  
منزل پہ بھی تلووں سے کانٹے نہ نکالیں گے

ہم گلشن فطرت سے جینے کی ادا لیں گے  
شاخوں سے چک لیں گے کانٹوں سے آنا لیں گے

دنیا کے ہر اک غم سے بہتر ہے غمِ جاناں  
سو شمع بجھا کر ہم اک شمع جلا لیں گے

میں عشق کا افسانہ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں  
یہ اہل ہوس میرا مفہوم چرا لیں گے



گھر ہوا گلشن ہوا صحراء ہوا  
ہر جگہ میرا جنوں رسوا ہوا

غیرتِ اہلِ چمن کو کیا ہوا  
چھوڑ آئے آشیاں جلتا ہوا

حسن کا چہرہ بھی ہے اُترا ہوا  
آج اپنے غم کا اندازہ ہوا

پُرسشِ غم آپ رہنے دیجئے  
یہ تماشا ہے مرا دیکھا ہوا

یہ عمارت تو عبادت گاہ ہے  
اس جگہ اک میکدہ تھا کیا ہوا

غم سے نازک ضبطِ غم کی بات ہے  
یہ بھی دریا ہے مگر نہ کہا ہوا

اس طرح رہبر نے لوٹا کارواں  
اے فنا رہن کو بھی صدمہ ہوا



اہل دیر و حرم رہ گئے  
ترے دیوانے کم رہ گئے

منزلیں دور ہوتی گئیں  
فاصلے کم سے کم رہ گئے

بے تکلف وہ اوروں سے ہیں  
ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے

جب بھی خط لکھنے بیٹھے اُنہیں  
صرف لے کر قلم رہ گئے

دیکھ کر تیری تصویر کو  
آئینہ بن کے ہم رہ گئے

میں نے ہر شے سنواری مگر  
ان کی زلفوں کے خم رہ گئے

اے فنا تیری تقدیر میں  
ساری دنیا کے غم رہ گئے



تو پھول کی مانند نہ شبِ نیم کی طرح آ  
اب کے کسی بے نام سے موسم کی طرح آ

ہر مرتبہ آتا ہے مہ نو کی طرح تو  
اس بار ذرا میری شبِ غم کی طرح آ

حل کرنے ہیں مجھ کوئی پیچیدہ مسائل  
اے جانِ وفا کیسوئے پُر خم کی طرح آ

زخموں کو گوارا نہیں یک رنگی حالات  
نشتر کی طرح آ کبھی مرہم کی طرح آ

نژدِ یکی و دوری کی کشاکش کو مٹا دے  
اس جنگ میں تو صلح کے پرچم کی طرح آ

مانا کہ مرا گھر تری جنت تو نہیں ہے  
دنیا میں مری لغزشِ آدم کی طرح آ

تو کچھ تو مرے ضبطِ محبت کا صلہ دے  
ہنگامِ فنا دیدہ پُر نم کی طرح آ

\*

مجھے رتبہ غم باتا پڑے گا  
اگر میرے پیچھے زمانہ پڑے گا

بہت غم زدہ دل ہیں کلیوں کے لیکن  
اصولاً انہیں مسکرانا پڑے گا

سکوں ڈھونڈنے آئے تھے میدے میں  
یہاں سے کہیں اور جانا پڑے گا

خبر کیا تھی جس بہاراں کی خاطر  
ہمیں آشیانہ جلانا پڑے گا

بہاراں نے گل کھلانے لگی ہے  
خزاں کو چمن میں بلانا پڑے گا

سکوتِ مسلسل مناسب نہیں ہے  
اسیرو! تمہیں غُلِ مچانا پڑے گا

فَا تَمْ هُوَ شَاعِرٌ تُوْ اَفْسَانَةٌ غَمٌ  
غُزل کی زبانی سنانا پڑے گا

\*



ظلمت شام سے بھی نورِ سحر پیدا کر  
قلبِ شبِ نعم کا ستاروں کی نظر پیدا کر

پھر کسی دامنِ رنگیں کی طرف آنکھ اٹھا  
پہلے اشکوں کیلئے دیدہٗ تر پیدا کر

رہ دشوار میں کر منزلِ آسائی کی تلاش  
اسی دیوار میں ہمت ہے تو در پیدا کر

موسمِ گل میں تو آ جاتی ہے کانٹوں پہ بہار  
باتِ توجہب ہے خزاں میں گلِ تر پیدا کر

کام آئیں گے نہ پروانے نہ اہلِ محفل  
اپنا فانوسِ خود اے شمع سحر پیدا کر

صحنِ گلشن نہ سہی دشت کا آغوش سہی  
وہشتِ دل کے لئے کوئی تو گھر پیدا کر

بخش دے مردہ دلوں کو غم بیدار فنا  
سینہ سنگ میں طوفانِ شر ر پیدا کر





اک تشنہ لب نے بڑھ کے جو ساغرا اٹھالیا  
ہر بولہوس نے میکدہ سر پر اٹھالیا

موجوں کے اتحاد کا عالم نہ پوچھئے  
قطرہ اٹھا اور اٹھ کے سمندر اٹھالیا

ترتیب دے رہا تھا میں فہرست دشمناں  
یاروں نے اتنی بات پہ خنجر اٹھالیا

میں ایسا بد نصیب کہ جس نے ازل کے روز  
پھینکا ہوا کسی کا مقدر اٹھالیا





حسن کا ایک آہ نے چہرہ نڈھال کر دیا  
آج تو اے دلِ حزیں تو نے کمال کر دیا

سہتارہا جفائے دوست کہتا رہا اداۓ دوست  
میرے خلوص نے مرا جینا محال کر دیا

میکدے میں ہے قحط مے یا کوئی اور بات ہے  
پیرِ مغاں نے کیوں مجھے جام سنبھال کر دیا

ختنے چمن پرست تھے سایہِ گل میں مت تھے  
اپنا عروج گلتاں نذرِ زوال کر دیا

خود مرا سوزِ جاں گداز چھپیر سکانہ دل کا ساز  
آپ کی اک نگاہ نے صاحبِ حال کر دیا

بزم میں سارے اہل ہوش ان کے ستم پر تھے خموش  
ایک جنوں پرست نے اٹھ کے سوال کر دیا

لطفِ فراقِ یار نے لذتِ انتظار نے  
دورِ دل و نگاہ سے شوقِ وصال کر دیا

سُن کے بیانِ میکیدہ دلکھ کے شانِ میکیدہ  
شیخِ حرم نے بھی فنا مے کو حلال کر دیا





ساقیا تو نے مرے ظرف کو سمجھا کیا ہے  
زہر پی لوں گا ترے ہاتھ سے صہبا کیا ہے

میں چلا آیا ترا حسنِ تغافل لے کر  
اب تری اجمین ناز میں رکھا کیا ہے

نہ بگو لے ہیں نہ کانٹے ہیں نہ دیوانے ہیں  
اب تو صحراء کا فقط نام ہے صحراء کیا ہے

ر  
ہو کے ما یوسِ وفا ترکِ وفا تو کروں  
لیکن اس ترکِ وفا کا بھی بھروسہ کیا ہے

کوئی پابندِ محبت ہی بتا سکتا ہے  
ایک دیوانے کا زنجیر سے رشتا کیا ہے

ساقیا کل کے لئے میں تو نہ رکھوں گا شراب  
تیرے ہوتے ہوئے اندیشہ فردا کیا ہے

میری تصویرِ غزل ہے کوئی آئینہ نہیں  
سیکڑوں رخ ہیں ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے

صف گولی میں تو سنتے ہیں فنا ہے مشہور  
دیکھنا یہ ہے ترے منھ پہ وہ کہتا کیا ہے





راہِ محبت میں اگر جائے  
نقشِ قدم بن کے ٹھہر جائے

آج کچھ اس طرح سنور جائے  
آئینے کے دل میں اُتر جائے

سارا زمانہ ہے نمکدانِ مٹے  
لے کے کہاں زخمِ جگر جائے

ترکِ وفا ہے کہ وفا ہے درست  
آج کوئی فیصلہ کر جائے

آج کے انسان کی حالتِ فنا  
دیکھنے سایہ بھی تو ڈر جائے





اے حسن زمانے کے تیور بھی تو سمجھا کر  
اب ظلم سے بازا آ جا ب جور سے توبہ کر

ٹوٹے ہوئے پیکار سہی لیکن  
میخانے سے اے ساقی باہر تو نہ پھینکا کر

جلوہ ہو تو جلوہ ہو پرداہ ہو تو پرداہ ہو  
تو بینِ تحلی ہے چمن سے نہ جہان کا کر

اربابِ جنوں میں ہیں کچھ اہلِ خرد شامل  
ہر ایک مسافر سے منزل کونہ پوچھا کر



## قطعات

وہ بادل اٹھے جھوم کر کالے کالے  
کھلنے لگے میکدوں میں پیالے  
مری توبہ ناصح امانت سمجھنا  
کئے جا رہا ہوں میں تیرے حوالے



جو شِگریہ ہے اضطرابی ہے  
اس لئے آنکھ پچھے گلابی ہے  
ضعف سے لڑ کھڑا رہے ہیں قدم  
لوگ کہتے ہیں یہ شرابی ہے

## رباعی

قطرے کا نہیں علاج طوفان کیجیے  
دنیا کے ہر اک درد کا درماں کیجیے  
مغرور کا غم خود ہی سمت آئے گا  
لازم ہے کہ پیدا غم انساں کیجیے



## متفرق اشعار

جب میرے راستے میں کوئی میکدہ پڑا  
اک بار اپنے غم کی طرف دیکھنا پڑا



اک تیرے دیکھنے کیلئے بزم میں مجھے  
اوروں کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا



ترک تعلقات کو اک لمحہ چاہئے  
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا



بزم سے یوں اجائے گئے  
تیرگی بھی چرائے گئے



کچھ نئی آستینیں بنیں  
کچھ نئے سانپ پالے گئے



بند کرلو در میکدہ  
ناپ کر پینے والے گئے



اندھروں کو نکala جا رہا ہے  
مگر گھر سے اجala جا رہا ہے



چھوئے جائینگے تلووں میں نشر  
ابھی کاشا نکala جا رہا ہے



دن گزر گیا اعتبار میں  
رات کٹ گئی انتظار میں



میں یوں بھی جانتا ہوں تیرے حضور رہنا  
کچھ پاس پاس رہنا کچھ دور دور رہنا



قاتل سے کوئی سیکھے فنِ ستم گری کو  
لاکھوں کو قتل کرنا اور بے قصور رہنا



بگڑا ہوا نظام بہاراں سنجھاں دو  
یا کچھ دنوں چمن کی ہمیں دیکھ بھاں دو



کل رات اک بزرگ نے پی تھی ہمارے ساتھ  
یار و ذرا ہماری صراحی کھنگال دو





یہ لمحہ میرے لئے باعث صد افتخار ہے کہ جناب فنا نظامی مرحوم پر ایک وقیع و مبسوط کتاب جگرا کادمی کے زیر اہتمام شائع ہوئی جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی اور دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگی۔

فنا نظامی مرحوم ایک بلند پایہ شاعر تھے، ہی ایک بے مثال انسان بھی تھے۔ مجھے ان کی ہم نشینی میں خوبصورت لمحہ گزارنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ مجھ سے بیہد محبت فرماتے تھے۔ ان کی کمی ہمہ وقت محسوس ہوتی رہے گی۔

فنا نظامی فن و شخصیت ہر نقطہ نظر سے اہم ترین کتاب ہے جس میں انکی شاعری و شخصیت پر مشاہیر ادب کے مضامین بھی ہیں اور ان کا دل پذیر کلام بھی جو برسوں ہندو پاک کے مشاعروں میں اپنا جادو جگاتا رہا اور آج بھی جس کی درختانی اور دل نوازی میں کمی نہیں آئی۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بے حد مقبول ہوگی اور دعا کرتا ہوں کہ ادیبوں کی نسل اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرے گی۔



عبدالحمید شیخ

(سکریٹری جگرا کادمی)